عنایت اللہ
دو پُلوں کی کہانی
کشمیر میں کمانڈو ایکشن اور پاک بھارت جنگ کی ولولہ انگیز معرکہ آرائیاں
مکتبہ داستان

فہرست

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں فرمایا ہے !

"اے نبیؐ! مومنین کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور تم میں سے سو آدمی (ثابت قدم رہنے والے) ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے۔"

(سورہ الانفال۔ ۸)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین کو جس طرح جہاد کی ترغیب دی وہ غزوات کی تفصیلات پڑھنے سے واضح ہوتی ہے اور یہ حقیقت تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے کہ مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں سینکڑوں کی تعداد میں ہزاروں کفار کا اور ہزاروں کی تعداد میں لاکھوں کفار کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ مسلمان سپہ سالاروں کی جنرل شپ کو یورپ کے مؤرخ آج بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آنحضورؐ نے اپنی اُمت میں عسکری روح پھونک دی اور فن سپہ گری مسلمان کے خون میں شامل کر دی تھی۔ عالمِ کفر آج تک عالمِ اسلام کی عسکری روح کو مارنے کے جتن کر رہا ہے۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو قائداعظمؒ نے سب سے زیادہ اہمیت مسلمانوں کی عسکری فطرت اور فنِ حرب و ضرب کو دی تھی۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظمؒ نے پاکستان کا دورہ کیا تو ہر جگہ اُنہوں نے اسلام کی عسکری روایات کو زندہ کرنے پر زور دیا اور دشمن کے عزائم

سے خبردار کیا۔ قائداعظمؒ کی صرف ایک تقریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ تقریر لاہور کے جلسۂ عام میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کی تھی۔ انہوں نے کہا:

"آپ کو صرف اپنے آباؤ اجداد کی طرح مجاہدانہ جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اُس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تاریخ بہادری، شجاعت اور بلندیٔ کردار کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی نئی زندگی کو ان روایات کے سانچے میں ڈھالئے اور اس تاریخ میں ایک اور درخشاں باب کا اضافہ کیجئے۔"

یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسے ایک دو صفحات پہ نہیں سمیٹا جاسکتا۔ میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ہمارے دین کے دشمنوں نے ہمارے بچوں کے ذہنوں سے اپنی عسکری روایات کو دھو ڈالنے کے لئے بڑے ہی پُرکشش بلکہ طلسماتی ذرائع استعمال کئے ہیں اور انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اُنہوں نے یہ کامیابی فلموں، ڈسکو اور پاپ موسیقی اور عُریاں لٹریچر کے ذریعے حاصل کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے نوجوان کس طرح اپنے آباؤ اجداد کے کلچر سے دستبردار ہوتے اور اپنے دین کے دشمن کے کلچر میں رنگے گئے ہیں۔ کردار نہیں رہا، شرم و حجاب نہیں رہا، قومی وقار نہیں رہا۔

ذاتی وقار ہی سے انسان دستبردار ہو جاتے تو قومی وقار کہاں باقی رہتا ہے۔

ہمارا دشمن اپنے عزائم میں صرف اس لئے کامیاب ہُوا کہ ہم نے اپنی ابھرتی ہوتی نسلوں سے نگاہیں پھیر لی تھیں اور ان کی تربیت کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے لیڈروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنی تمام تر توجہ اور توانائی اقتدار کے حصول پر مرکوز کر دی اور دشمن کو نظریاتی تخریب کاری کا موقع فراہم کیا۔

پھر یہ ذمہ داری صحافیوں اور ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے قلم کی عصمت نیلام کر ڈالی ہے اور جو چڑھتے سورج کی پوجا میں گم ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے یہ نہ دیکھا کہ قوم کے نونہالوں کو پڑھنے کے لئے کیا ملتا ہے۔

قوم کے نونہال بے قصور ہیں۔ انہیں کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ان کی روایات کیا ہیں۔

میں یہ فرض پورا کر رہا ہوں۔ یہ چند ایک جنگی کہانیاں جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ اور جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ہیں۔ ان میں آپ کو آزاد کشمیر کی وادیٔ لیپا کا بھی ایک معرکہ پوری تفصیل اور پورے پس منظر سے ملے گا۔

میں انہیں کہانیاں کہہ رہا ہوں لیکن یہ افسانے نہیں، یہ حقیقی واقعات ہیں اور ان کے کردار افسانوی نہیں۔ یہ وطن کے سرفروشوں کی شجاعت کی سچی داستانیں ہیں جو میں نے محاذوں پر جا کر اور ان کے زندہ کرداروں سے سُن کر قلمبند کی ہیں۔ انہوں نے اسلام کی عسکری روایات کو زندہ کیا اور انہیں تاریخ کے دامن میں ڈال دیا۔ یہ روایات اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں کہ انہیں ایک مقدس ورثہ سمجھ کر اپنی اُبھرتی ہوتی نسلوں کے سپرد کیا جاتے۔

اب یہ فرض والدین کا اور اساتذہ کا ہے کہ وہ یہ ولولہ انگیز اور ایمان افروز کہانیاں قوم کے نونہالوں تک پہنچائیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

نوّے جانباز اور آٹھواں نشانِ حیدر

پُل کنجری کا معرکہ جو فائر بندی کے بعد لڑا گیا تھا، پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کا ایک محدود ایکشن ہے۔ جب جنگوں کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس قسم کے چھوٹے چھوٹے معرکوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس قسم کے ایک فقرے میں بات ختم کر دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ ایک کمپنی نے ایک گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ پُل کنجری کا ایکشن بھی تاریخ میں ایک فقرے میں بیان کر دیا جائے گا یا سرے سے نظر انداز ہی کر دیا جائے گا۔

مگر بنیادی طور پہ جو خطرہ لاحق ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ہاں تاریخ لکھنے کا رواج ہی نہیں۔ ہماری سرحد کی مٹی کا ذرّہ ذرّہ شہیدوں کے خون سے پرنور ہے اور جو ٹینکوں تلے کچلے گئے تھے اور جن کے جسموں کے پرخچے گولا باری سے بکھر گئے تھے، ان کی ہڈیاں ابھی تک سرحد کی کھیتوں میں پڑی ملتی ہیں مگر تاریخ انہیں پہچاننے سے معذور ہے۔ وہ کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ وہ مائیں کہاں ہیں جن کے دودھ کی دھاریں سرحد پہ جا کر آگ کا دریا بن گئی تھیں اور جن کی لوریاں نعرۂ حیدری کی گرج بن گئی تھیں؟ —— انہیں کوئی نہیں جانتا کیونکہ تاریخ ان سے ناآشنا ہے۔

پل کنجری کا جوابی حملہ بھی ایسے ہی معرکوں میں سے ہے جو تاریخ کے پیٹ میں جا کر گم ہو جائے گا یا پاک فوج کے سرکاری کاغذات میں جن پر SEC RET) کی مہر لگی ہوتی ہے دب کر تاریخ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا مگر یہ راز نہیں جو چھپایا جائے۔ محدود سے اس ایکشن میں جانبازانہ قیادت اور شجاعت

کے جو مظاہرے ہوئے ہیں، وہ فوج کی جنگی ڈیوٹی سے بالاتر تھے جسے ہم غیر فوجی زبان میں حُب الوطنی کی دیوانگی کہتے ہیں۔ چھوٹا سا یہ معرکہ ہمارے چند ایک جوانوں کا عظیم کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ ایک روایت ہے اور یہ روایت ایک مقدس ورثہ ہے جو ہمیں کل کی پاک فوج اور آنے والی نسلوں کے حوالے کرنا ہے۔

ہمارے ہاں ابھی تک انگریزی کی نظم "چارج آف دی لائٹ بریگیڈ" زبانی یاد کرائی جاتی ہے۔ پُل کنجری کی داستانِ شجاعت سُننے سے پہلے ایک فرق سمجھ لیجئے۔ "چارج آف دی لائٹ بریگیڈ" میں چھ سوساون گھوڑا سوار تھے اور پُل کنجری پر حملہ کرنے والے صرف نوّے پیادہ نوجوان تھے جن کا کمانڈر کیپٹن فضلِ معید ستارۂ جرأت تھا۔ برطانیہ کے چھ سوساون گھوڑا سواروں کا حملہ ایک توپ خانے پر تھا جس کی توپوں کو آج کی طرح میکانکی تیزی سے اِدھر اُدھر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کے نوّے جوانوں کا مقابلہ توپ خانے کی قیامت خیز گولہ باری سے تھا اور ایسے دشمن سے جو مضبوط بنکروں میں مورچہ بند تھا اور جس نے گاؤں کی کھڑکیوں اور روشندانوں میں بھی مشین گنیں لگا رکھی تھیں۔ دشمن محفوظ مورچہ بندی میں تھا اور اسے بلندی کا فائدہ حاصل تھا اور ہمارے جوان بالکل سامنے کھُلے میدان میں تھے جہاں انہیں کوئی آڑ میسّر نہیں تھی ـــــ اور ہمارے جوانوں کے لیے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ دشمن نے ہمارے پہلے کے جنگی قیدیوں کو ڈھال کے طور پر ایک چوبارے کی چھت پر کھڑا کر دیا تھا اور ان کی ٹانگوں میں سے مشین گنیں فائر کر رہا تھا۔ دشمن کا دفاع نیم دائرے کی شکل میں تھا۔

اور یہ تھا وہ جہنم جس میں ہمارے جوان کود گئے تھے۔ اس معرکے نے پاک فوج کو ایک نشانِ حیدر، دو ستارۂ جرأت اور دو تمغۂ جرأت دیئے۔

پُل کنجری واہگہ چیک پوسٹ کے شمال میں تقریباً ساڑھے تین میل دُور اور سرحد سے ایک میل دُور بھارت کے علاقے میں ایک بڑا گاؤں ہے جس کے بہت سے مکان پختہ اور دو منزلہ ہیں۔ گاؤں کے ساتھ ساتھ دشمن نے

کنکریٹ کے مضبوط بنکر بنا رکھے ہیں۔ گاؤں سے کوئی ساڑھے تین سو گز دُور بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس کی مضبوط پوسٹ ہے۔

۳؍ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام جب مغربی محاذ پر بھی جنگ شروع ہو گئی تو پاک فوج کی ایک رجمنٹ نے حملہ کر کے پل کنجری اور پوسٹ پر قبضہ کر لیا۔ ۴ سے ۱۶ دسمبر تک دشمن نے اس مقام پر تابڑ توڑ حملے کیے لیکن گاؤں اور پوسٹ کو ہمارے جیالوں کے قبضے سے نہ چھڑا سکا۔ بھارت کی وزیر اعظم نے فائر بندی کا اعلان کر دیا جسے ہماری حکومت نے قبول کر لیا اور بھارت کے مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق پاک فوج کو ۱۷؍ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام ساڑھے سات بجے فائر بند کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ عین وقت پر فائر بندی کر دی گئی مگر ہندو نے اپنی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہی پیش کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور جب ہماری مشین گنیں خاموش ہو چکی تھیں، بھارتیوں نے واہگہ اٹاری سیکٹر میں پل کنجری کے مقام پر اس قدر شدید گولہ باری شروع کر دی جو جنگ کے دوران بھی انہوں نے کبھی نہیں کی تھی۔

ہمارا توپ خانہ معاہدے کے احترام میں خاموش رہا اور بھارتیوں کے توپ خانے کی خاموشی کا انتظار کرتا رہا۔ رات ساڑھے دس بجے ایسی شدید گولہ باری کی آڑ میں بھارت کی نمبر ۲ سکھ رجمنٹ نے پُل کنجری پر حملہ کر دیا۔ ہماری جو کمپنی وہاں مورچہ بند تھی اسے ایسے حملے کی بالکل ہی توقع نہیں تھی۔ اچانک حملے اور بے پناہ گولہ باری کی وجہ سے کمپنی جم کر نہ لڑ سکی۔ اس کے نتیجے میں گاؤں پر دشمن نے قبضہ کر لیا اور ہمارے ایک افسر کیپٹن رضوی اور بارہ تیرہ جوانوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔

اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دشمن فائر بندی سے فائدہ اٹھا کر اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینا چاہتا ہے۔ یہ خطرہ آگے بڑھ کر لاہور کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ دشمن کی نیت کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نیت کی کامیابی کے لیے پُل کنجری کو جنگی اہمیت حاصل تھی۔ اس خطرے کو سرحد سے باہر رکھنے کے لیے لازمی ہو گیا کہ دشمن کو پُل کنجری سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے اور فائر بندی

ملتوی سمجھی جائے۔ چنانچہ اپنے توپ خانے کو دشمن کے توپ خانے کو خاموش کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اپنی بڑی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ لاہور کے شہری فائر بندی کی رات اور اگلے دن محاذ کے جو دھماکے سنتے رہے ہیں، وہ اسی معرکے کی گولہ باری تھی۔

ایک اور پنجاب رجمنٹ لیفٹیننٹ کرنل سیرل لی امین کی زیرِ کمان ریزرو میں تھی۔ اس کی دو کمپنیوں کو پل کنجری کے مقام پر بلایا گیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور یہ کمپنیاں بارہ میل دور تھیں۔ دونوں کمپنیاں پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک کمپنی کو پل کنجری پر جوابی حملے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس کے کمپنی کمانڈر چارسدہ تحصیل کے گاؤں قاضی خیل کے رہنے والے کیپٹن فضلِ معید تھے۔ اس علاقے کی پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال نے کیپٹن فضلِ معید کو گاؤں، علاقے اور دشمن کے متعلق معلومات دیں مگر یہ معلومات اس لیے ناکافی تھیں کہ دشمن نے رات کی تاریکی میں گاؤں پر قبضہ کیا تھا اور کچھ علم نہیں تھا کہ تاریکی میں اس نے کہاں کہاں پوزیشنیں قائم کر لی ہیں، اس کی نفری کتنی اور فائر پاور کیا ہے اور اس کی مورچہ بندی کیسی اور کہاں ہے۔

کیپٹن فضلِ معید کے لیے دوسری بڑی دشواری یہ تھی کہ اس علاقے سے، زمین سے اور قدرتی رکاوٹوں وغیرہ سے وہ بالکل ناواقف تھے کیونکہ وہ دوسرے علاقے سے یہاں پہلی بار آئے تھے۔ انہیں اپنے طور پر مشاہدہ (ریکی) کرنے کا موقعہ نہ مل سکا کیونکہ اتنا وقت نہیں تھا اور وقت اتنا گذر چکا تھا جو دشمن کے لیے پوزیشنیں مستحکم کرنے کے لیے کافی تھا۔

حملے کا وقت ۱۸ دسمبر کی صبح پونے چھ بجے مقرر کیا گیا۔ کیپٹن معید کی کمپنی جس کی نفری نوّے تھی، حملے کی ابتدا کے مقام پر پہنچ گئی۔ یہ دسمبر کی سحر تھی جب سردی عروج پر تھی۔ سحر ابھی تاریک تھی۔ کمپنی کی تین پلاٹونیں تھیں۔ ایک پلاٹون کے کمانڈر حوالدار علی اصغر تھے۔ دوسری کے نائب صوبیدار محمد ریاض شہید ستارۂ جرأت اور تیسری کے کمانڈر تھے حوالدار محمد شریف۔ کمپنی کے سینئر جے۔سی۔او صوبیدار محمد اکرم تھے۔

حملے کی ترتیب یہ تھی: حوالدار محمد شریف کی پلاٹون درمیان میں تھی۔ نائب صوبیدار محمد ریاض شہید کی دائیں طرف اور حوالدار علی اصغر کی پلاٹون کو بائیں پہلو پر رکھا گیا۔ لانس نائیک محمد محفوظ شہید اسی پلاٹون میں تھا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ جان کا نذرانہ دے کر پاکستان کا آٹھواں نشانِ حیدر کہلائے گا۔

حملہ سامنے سے کیا گیا۔ حملہ آور جانباز اس زمین پر اجنبی تھے۔ وہ جب آگے بڑھے تو دشمن نے فائر نہ کھولا۔ سحر ابھی تاریک تھی۔ گاؤں سے کوئی ستر گز دُور ایک خشک نالہ تھا جس کی چوڑائی تقریباً دو گز تھی اور گہرائی پانچ چھ فٹ۔ اس کے کناروں پر جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ کچھ ان کی وجہ سے اور زیادہ تر اندھیرے کی وجہ سے نالے کو کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ جوان چلتے چلتے نالے میں گرنے لگے اور اس طرح دو پلاٹونیں نالے میں جا پڑیں۔ جوانوں کے پاس مشین گنیں، رائفلیں وغیرہ اور ایمونیشن کا بوجھ تھا۔ نالے کے چھ فٹ اونچے اور عمودی کنارے پر چڑھنا اکیلے اکیلے جوان کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ جوان ایک دوسرے کو اُٹھا اُٹھا کر اُوپر چڑھانے لگے اور جو اُوپر چڑھائے جاتے تھے، وہ نیچے والوں کو اُوپر کھینچ لیتے تھے۔ اسی طرح نالہ پار کرتے کچھ دیر لگ گئی۔

جوان نالے سے پار ہوئے تو اُجالا اتنا ہو گیا تھا کہ ایک سو گز تک نظر آسکتا تھا۔ یہ فاصلہ گاؤں سے بمشکل ستر گز تھا۔ دشمن نے مشین گنوں اور رائفلوں کا ایسا کراس فائر شروع کر دیا کہ زمین کا کوئی ایک انچ بھی محفوظ نہ رہا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں موسلا دھار بارش کی طرح برسنے لگیں۔ رینج تو کوئی تھا ہی نہیں۔ دشمن کے مشین گنر ہمارے جوانوں کو دیکھ دیکھ کر بوچھاڑیں فائر کر رہے تھے۔ ایسے کراس فائر سے زندہ نکلنا ناممکن تھا۔ جوان گرنے اور تڑپنے لگے۔

کمپنی کمانڈر کیپٹن فضلِ معید نے فائر کی اس شدّت سے اندازہ لگایا کہ گاؤں میں دشمن کی نفری کتنی ہے۔ اس فائر میں پھنس کر انہیں معلوم ہوا کہ گاؤں کے باہر کنکریٹ کے بنکر ہیں جن سے مشین گنیں فائر کر رہی ہیں اور جن پر جوابی

فائر کارگر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے دیکھا کہ بہت سے مکانوں کی کھڑکیوں میں
سے بھی اور چھتوں پر بنے ہوئے مورچوں سے بھی دشمن فائر کر رہا تھا۔ کمپنی کی
پوزیشن یہ تھی کہ بعض جوان گاؤں سے یعنی دشمن کے آگ اگلتے مورچوں سے
صرف تیس گز دور تھے اور بعض ایک سو گز دور۔ وہ دشمن کے لیے نہایت
آسان ٹارگیٹ تھے۔

کیپٹن معید نے جب اپنی کمپنی کا جائزہ لینے کے لیے دائیں بائیں اور
پیچھے دیکھا تو انہیں اپنا جو بھی جوان نظر آیا لہولہان نظر آیا۔ ہر کسی کو گولی لگی تھی'
کوئی شہید ہو چکا تھا، کوئی ہو رہا تھا۔ کیپٹن معید کو حوالدار محمد شریف کی پلاٹون کے
متعلق جو بائیں طرف تھی شک ہوا کہ ساری کی ساری ختم ہو چکی ہے۔ وہ وائرلیس
آپریٹر لانس نائیک محمد بنارس کو اس پلاٹون سے ملاپ کرنے کے لیے کہنے
لگے۔ بنارس ایک زخمی سپاہی کی رائفل سے دشمن پر فائر کر رہا تھا۔ اس کے
کندھے پر مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ گولیاں کندھے میں سے پار ہو گئیں۔
اس کا وائرلیس اسی کندھے کے پیچھے بندھا ہوا تھا۔ گولیاں اس کے کندھے سے
گزر کر سیٹ سے بھی پار ہو گئیں اور سیٹ بالکل ناکارہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ کمپنی کمانڈر کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ وائرلیس سیٹ اور بھی تھے مگر معلوم ہوا کہ کوئی
بھی سیٹ سلامت نہیں۔ اب پیچھے اطلاع دینے کا کوئی ذریعہ نہ رہنے کی وجہ
سے مدد بھی نہیں مانگی جا سکتی تھی نہ پلاٹونیں ایک دوسری سے ملاپ کر سکتی
تھیں۔

ایسی صورتِ حال میں کیپٹن معید اور صوبیدار محمد اکرم کا کام بہت ہی دشوار
ہو گیا۔ وہ پوزیشن میں لیٹے نہیں رہ سکتے تھے۔ دشمن کا فائر پہلے کی طرح بادو باراں
کے طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے توپ خانے کی گولہ باری
شروع کر دی۔ زیادہ تر گولے پیچھے پھٹ رہے تھے جس سے دشمن کا مقصد یہ
تھا کہ پیچھے سے کمپنی کو کوئی مدد نہ ملے۔ گولہ باری کمپنی پر بھی ہو رہی تھی۔ اب
کمپنی کے جوانوں کا یہ عالم تھا کہ ان کے قریب گولے پھٹ رہے تھے جن کے
لال انگارہ ٹکڑے انہیں لہولہان کر رہے تھے۔ ان کے مہیب دھماکوں سے

ان کے دماغ ماؤف ہو رہے تھے۔ کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے اور
مشین گنوں کی گولیاں بارش کی طرح پڑ رہی تھیں اور کوئی آڑ نہیں تھی۔ جوان
زمین سے چپک گئے تھے۔

صوبیدار محمد اکرم دوڑ دوڑ کر زخمیوں کو دیکھنے لگے۔ کیپٹن معید نے
آوازیں دے دے کر کہا کہ جو زخمی پیچھے نکل سکتے ہیں رینگ کر پیچھے چلے
جائیں اور اس کے ساتھ ہی وہ کمپنی کی مشین گنوں کو بہتر پوزیشنوں میں
لگانے لگے۔ زیادہ تر مشین گنیں بھی تباہ ہو چکی تھیں۔ تاہم جوان اس
حال میں بھی نہایت کارگر فائر کر رہے تھے۔ کیپٹن معید نے دیکھا کہ دشمن
گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہیں گاؤں کے اندر سے دشمن کی ایک
پلاٹون جس کی نفری پچیس تیس کے درمیان تھی، اس سمت تیزی سے جاتی نظر
آئی جدھر کمپنی کی تیسری پلاٹون تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کی یہ پلاٹون تڑپنے
لگی اور پوری کی پوری ختم ہو گئی۔

یہ کارنامہ لانس نائیک محمد محفوظ شہید کا تھا۔ اس کے پاس مشین گن تھی۔
اس نے لمبے لمبے برسٹ فائر کر کے دشمن کی پوری کی پوری پلاٹون کو ختم کر دیا۔
اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دشمن گھیرا نہ ڈال سکا لیکن وہ گھیرے کی کوشش بہرحال
کر رہا تھا۔ نصف گھیرا تو تھا ہی کیونکہ دشمن کی پوزیشنیں تقریباً نیم دائرے میں
تھیں اور ہمارے جوان اس نیم دائرے میں لڑ رہے تھے۔ دشمن نے درختوں پر
بھی سنائپر بٹھا رکھے تھے جو نہایت اچھی نشست لے کر فائر کر رہے تھے۔
اس طرح ہمارے جوانوں پر سامنے سے بھی فائر آ رہا تھا، دائیں اور بائیں
سے بھی۔ یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ دشمن نے چوباروں پر بھی مشین گنیں لگا رکھی
تھیں جہاں سے دشمن کو نیچے ہر ایک چیز اور ہر ایک آدمی نظر آتا تھا۔

کیپٹن معید نے دیکھا کہ دشمن دوسری طرف سے گھیرا ڈالنے کی کوشش
کر رہا ہے۔ انہوں نے دو مشین گنیں اس طرف لگا دیں جونہی کوئی بھارتی
ادھر سے سامنے آتا تھا ہماری مشین گنیں اسے اوندھا کر دیتی تھیں۔
اب کمپنی کی نفری نوے نہیں بمشکل ستر رہ گئی تھی اور اپنی کئی مشین گنیں

کے نائک بازخان کو آواز دے کر کہا کہ بائیں والوں کو تباہ و کر ڈٹے رہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں ڈالے گا۔

تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں بڈھیال کا رہنے والا نائک بازخان جو نامی گرامی ایتھلیٹ تھا، مشین گن فائر کر رہا تھا۔ وہ اپنے جوانوں کو بتانے کے لیے کہ کوئی ہتھیار نہیں ڈالے گا جوش میں آ کر اٹھا۔ مشین گن کا برسٹ اس کی ران میں سے گذر گیا۔ ہڈی بچ گئی لیکن گوشت بُری طرح کٹ پھٹ گیا اور ٹانگ کی نہایت اہم رگیں کٹ گئیں۔ اس کے باوجود اُس کے بیان کے مطابق اسے درد بالکل محسوس نہیں ہُوا۔ یہ فرض کی لگن کا کرشمہ تھا کہ اُس نے ایسے شدید اور بھیانک زخم کی پروا نہ کی اور اپنی مشین گن سنبھال لی۔ اس طرف دشمن ابھی تک گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نائک بازخان نے گن کا رُخ بدلا۔ دشمن کے چند ایک جوان پچیس گز کے فاصلے تک آ گئے تھے۔ بازخان کی مشین گن نے انہیں ختم کر دیا۔ قریب ہی ایک اور مشین گن تھی جس کا نمبر دو سپاہی شیر افضل تھا۔ اس کے کندھے سے گولیاں گزر گئی تھیں۔ اس کی جگہ سپاہی غلام جیلانی مشین گن فائر کر رہا تھا۔

دشمن تھوڑی تھوڑی دیر بعد للکارتا تھا کہ ہتھیار ڈال دو، تم گھیرے میں ہو۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ اس للکار کے ساتھ دشمن کے افسر اور جوان ننگی گالیاں دے رہے تھے۔ اس کے جواب میں ہمارے جوانوں نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں اور اپنی نفری تیزی سے ختم ہونے کے باوجود اور زخمی حالت میں بھی مقابلہ جاری رکھا۔

کیپٹن معید نے دیکھا کہ دشمن کو کمک مل رہی تھی۔ نقصان اُٹھانے کے باوجود اس کے فائر میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ اب دشمن نے ایک اوچھی چال چلی۔ رات کے وقت اُس نے فائر بندی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے پُل کنجری پر حملہ کر کے ہمارے ایک کیپٹن اور چند ایک جوانوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ سکھ رجمنٹ کے افسروں نے اب دیکھا کہ کیپٹن معید کی کمپنی اتنے نقصان کے باوجود ہتھیار نہیں ڈال رہی اور جو جوان بچ گئے ہیں وہ گاؤں کے لیے خطرہ

تباہ ہو چکی تھیں۔

دشمن کے ایک سکھ افسر نے چھت پر سے بلند آواز میں گالی دے کر کہا —— "ہتھیار ڈال دو اور ہاتھ اُوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ تم ہمارے گھیرے میں ہو" —— اس دوران دشمن نے گولہ باری روک لی تھی۔

اس آواز پر کیپٹن معید کے جوانوں نے (جو اُن کے قریب تھے) ان کے منہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کمپنی کمانڈر کا جواب اور فیصلہ سُننے کے لیے بے تاب تھے۔ ایسی صورت حال میں جب کمپنی کی بیشتر نفری ختم ہو چکی ہو، پیشقدمی ناممکن ہو، پسپائی بھی ممکن نہ رہے، عقب سے رابطہ بھی ٹوٹ جائے، ایمونیشن بھی ختم ہو رہا ہو اور گھیرا پڑ جائے تو نہایت آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور زندہ رہو۔

کیپٹن معید اُس وقت کو یاد کر کے کہتے ہیں —— "ایک روز ہی پہلے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے گئے تھے۔ بے شک میرے ہتھیار ڈالنے سے میرا ملک ہاتھ سے نہیں جاتا تھا۔ یہ چند ایک جوانوں کی ایک چھوٹی سی کمپنی تھی۔ اگر ہم ہتھیار ڈال بھی دیتے تو ملک کو کوئی نقصان نہ ہوتا لیکن میں نے سوچا، کیا میری قوم کی قسمت میں ہتھیار ڈالنا ہی رہ گیا ہے؟ میں نے فیصلہ کر لیا کہ قوم دوسری بار یہ خبر نہیں سُنے گی کہ ہماری فوج کے ایک اور افسر نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میں نے سکھ افسر کی گالی اور للکار سُنی۔ وہ مجھ سے دُور نہیں تھا۔ میں نے بلند آواز سے جواب دیا —— سپاہی گالی نہیں دیا کرتے، مردوں کی طرح لڑتے ہیں۔ ہم گالی نہیں دیں گے۔ ہم لڑنے آئے ہیں۔ ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ لڑو اور ہمیں ختم کر دو۔ —— میں نے اِدھر اُدھر دوڑ دوڑ کر بچے کھچے جوانوں کو اچھی پوزیشنوں پر کر دیا۔ میرے جواب سے جوانوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا اور وہ نعرے لگا لگا کر فائر کرنے لگے۔"

دشمن نے ایک بار پھر توپ خانے کی گولہ باری شروع کر دی۔ اس دوران کمپنی کے کچھ جوان ہر طرف سے برستی گولیوں اور گولہ باری میں گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اپنے کمپنی کمانڈر کا اعلان سُن کر صوبیدار محمد اکرم نے ساتھ والی پلاٹون

بن گئے ہیں تو دشمن نے ہمارے قیدیوں کو ایک چوبارے کی چھت پر کھڑا کر دیا، اور مشین گنیں ان کی ٹانگوں میں رکھ دیں۔ دشمن کے ایک افسر نے گولہ باری رکوا کر بلند آواز سے کہا ۔۔۔ "یہ دیکھو اپنے قیدی۔ ان میں تمہارا کیپٹن رضوی بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہتھیار ڈال کر ہمارے پاس آ جاؤ۔ یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

کیپٹن معید نے دیکھا کہ پاک فوج کے جوان سامنے کھڑے تھے۔ ان کی پیٹھیں ہماری کمپنی کی طرف تھیں۔ فاصلہ ایک سو گز سے ذرا زیادہ تھا کیپٹن معید نے اُٹھ کر بلند آواز اپنے جوانوں کو خبردار کرنا شروع کر دیا کہ فائر روک لو۔ سامنے اپنے آدمی کھڑے ہیں ۔۔۔ فائر رک گیا۔ کیپٹن معید نے دشمن کو بلند آواز سے کہا ۔۔۔ "جنگجو قوم ایسی بزدلی کی حرکت نہیں کرتی۔ شرم کرو کیپٹن رضوی ہمیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کبھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ غیرت مند ہے، سپاہی کی طرح لڑو کافرو!"

بھارتی توپ خانہ ایک بار پھر آگ اور لوہا اُگلنے لگا۔ بائیں طرف کے ایک چوبارے میں ایک مشین گن لگی ہوئی تھی۔ وہ بہت نقصان کر رہی تھی۔ اس کے قریب ایک مشین گن ایک بنکر میں تھی۔ وہ کسی کو آگے نہیں جانے دیتی تھی۔ اب ہمارے جوان گاؤں پر ہلہ بولنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

کیپٹن معید نے اتنے زیادہ فائر اور گولہ باری میں دوڑ دوڑ کر اور چلا چلا کر بچی کھچی مشین گنوں کو ایسی پوزیشنوں پر لگا دیا کہ جس طرف سے دشمن گھیرا ڈالنے کے لیے آگے بڑھتا مشین گنیں اس کا راستہ روک لیتی تھیں۔ ہمارے جانباز پوزیشنیں بدل بدل کر دشمن پر فائر کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کیپٹن معید پیچھے اطلاع دینا چاہتے تھے کہ کمپنی کس حال میں پھنس گئی ہے تاکہ مدد آ جائے مگر تمام وائرلیس سیٹ تباہ ہو چکے تھے۔ گولہ باری نے پیچھے جانے کا راستہ بھی مسدود کر رکھا تھا۔ کمپنی کا لانس حوالدار عبدالعزیز آرمی کا تیراک تھا اور کئی مقابلے جیت چکا تھا۔ وہ کیپٹن معید کے قریب تھا مگر زخمی۔ اس کے زخم کی نوعیت یہ تھی کہ ایک گولی اس کی

ران میں ترچھی لگی اور کولہے میں سے نکل گئی تھی جس سے اس کی ٹانگ جسم کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ کیپٹن معید نے اُسے کہا کہ رینگ کر پیچھے جاؤ اور پیچھے یہاں کی صورت حال کی اطلاع دو۔

لانس حوالدار نے بخوشی یہ ڈیوٹی قبول کر لی اور پیچھے کی طرف رینگنے لگا مگر چند گز ہی گیا ہو گا کہ مشین گن کا پورا برسٹ اس کے جسم سے پار گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ شہادت سے پہلے اُس نے مشین گن سے دشمن کا گھیرا مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ لانس حوالدار عبدالعزیز شہید وزیرآباد کے گاؤں کوٹ یوسف کے رہنے والے رحمت علی کا بیٹا تھا۔ اس کی شہادت سے ایک نوجوان لڑکی خالدہ پروین کا سہاگ وطن پر قربان ہو گیا۔ اس کی شادی چند ہی ماہ پہلے ہوئی تھی۔

کیپٹن معید نے صوبیدار محمد اکرم سے کہہ دیا تھا کہ زخمیوں سے کہو کہ اپنے طور پر پیچھے نکلنے کی کوشش کریں۔ وائرلیس آپریٹر لانس نائیک محمد بنارس کے کندھے سے گولیوں کی بوچھاڑ گزر گئی تھی۔ لانس نائیک مہدی خان کے پاس چادر تھی جو اُس نے پھاڑ کر بنارس کے زخم پر باندھ دی۔

بنارس رینگ کر پیچھے نکلنے لگا۔ گولے اس کے قریب قریب پھٹ رہے تھے اور ہر طرف گولیوں کے زناٹے تھے۔ ایک گولے کے ٹکڑے اُس کی پیٹھ پر لگے لیکن زخم گہرا نہ آیا۔ راستے میں اسے ایک مشین گن پڑی ملی جو سپاہی عبدالرزاق کی تھی۔ تحصیل کہوٹہ کے گاؤں ٹکال کے رہنے والے لانس نائک بنارس نے ایک ہاتھ سے مشین گن لوڈ کی اور فائر کیا۔ سپاہی عبدالرزاق شہید ہو چکا تھا۔ بنارس کا جسم خون سے خالی ہو رہا تھا۔ وہ رینگ کر وہاں سے نکلنے لگا اور ایک کھڈ میں جا پڑا۔ جس میں گندا پانی تھا۔ کوشش کے باوجود وہ پانی سے نہ نکل سکا۔ زخم نے اسے معذور کر دیا تھا۔ اتنے میں سپاہی شیر افضل بھی رینگتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اس کے کندھے سے بھی گولیاں گزر گئی تھیں اور وہ بھی بنارس کی طرح معذور تھا۔ اس نے اپنا اچھا ہاتھ بڑھا کر لانس نائیک بنارس کو پانی سے گھسیٹ لیا۔ بنارس نے اُسے کہا کہ تم نکل جاؤ میں ختم

ہوں، میرے ساتھ نہ مرو۔ شیر افضل اسے اُٹھا یا گھسیٹ نہیں سکتا تھا۔ اتنے
میں لانس نائک محمد یوسف بھی رینگتا ہُوا وہاں آگیا۔ وہ اس طرح زخمی تھا کہ
گولی اس کی گردن میں سے گذر گئی تھی۔ اس نے بنارس کے گلے میں تولیہ باندھ کر
زخمی بازو اس میں ڈال دیا۔ شیر افضل اور بنارس اکٹھے رینگتے ہوئے سرکنڈوں
میں چلے گئے۔ گولیوں اور گولوں کا مینہ برس رہا تھا۔ اس کے بعد دونوں بیہوش
ہو گئے اور جب ہوش میں آئے تو وہ ہسپتال میں تھے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ
انہیں کون اور کس طرح وہاں سے اُٹھا لایا تھا۔

لانس نائک محمد یوسف جو سرگودھا کا رہنے والا ہے ایسی جگہ سے گردن
میں گولی کھا کر آیا تھا جہاں دشمن ان کے سر پر آگیا تھا۔ سپاہی خادم حسین مشین گن
کا نمبر ۲ تھا۔ اُس کے سر میں سے مشین گن کا برسٹ گذر گیا تھا۔ سپاہی انور شاہ
گن فائر کرتا رہا۔ لانس نائک محمد یوسف کو گردن میں گولی لگی۔ اس کے ساتھ
سپاہی منظور حسین، سپاہی محمد بشیر اور سپاہی محمد عزیز تھے۔ دشمن ان کے بہت ہی
قریب آگیا تو انہوں نے گرنیڈوں سے دشمن کو ختم کیا۔ یوسف رینگتا ہُوا واپس
آگیا۔ پیچھے سپاہی منظور حسین اور سپاہی محمد بشیر شہید ہو گئے اور سپاہی محمد عزیز
زخمی حالت میں قید ہو گیا۔

لانس نائک محمد محفوظ بائیں طرف تھا۔ وہ نامی گرامی باکسر تھا۔ اُس کی نظر
دشمن کی دو مشین گنوں پر تھی۔ ایک چوبارے سے فائر کر رہی تھی اور دوسری
قریب کے ایک بنکر میں تھی۔ محفوظ سیکشن کمانڈر تھا۔ مشین گن سپاہی سید محمد
فائر کر رہا تھا۔ وہ شہید ہو گیا۔ دشمن کا فائر پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہو گیا تھا
ادھر سے کیپٹن فضل معید نے لانس نائیک محفوظ کو آواز دے کر کہا کہ دشمن کی
اُس طرف والی مشین گن کو خاموش کرو۔ لانس نائیک محمد محفوظ نے سید محمد شہید
کی مشین گن سنبھال لی۔ اس وقت دشمن کی ایک پلاٹون گاؤں سے نکل کر کیپٹن معید
کی کمپنی کی دوسری دو پلاٹونوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ لانس
نائک محفوظ نے دشمن کے تمام آدمیوں کو ختم کر دیا۔ وہ خود دشمن کو نظر آرہا تھا۔
فاصلہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ دشمن کی ایک مشین گن کا لمبا برسٹ آیا جس سے

محفوظ کی مشین گن برباد ہو گئی اور اس کی ٹانگ بُری طرح زخمی ہو گئی۔
قریب ہی اپنی ایک اور مشین گن تھی جسے لانس نائک محمد صادق فائر
کر رہا تھا۔ اس گن نے بھی دشمن کا بہت نقصان کیا تھا مگر دشمن بلندی پر
ہونے کی وجہ سے ہماری ہر ایک گن کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی کسی مشین گن سے
لانس نائک محفوظ رینگ کر اُس گن تک پہنچا مگر ابھی دو برسٹ ہی فائر
کئے تھے کہ یہ گن بھی تباہ ہو گئی اور محفوظ اور زیادہ زخمی ہو گیا۔ اس نے یقیناً دیکھ
لیا تھا کہ اس پر بنکر کے اندر سے مشین گن کا فائر آیا تھا۔ وہ رائفل اٹھا کر بنکر
کی طرف رینگنے لگا۔

نائک باز خان نے جو شدید زخمی ہونے کے باوجود مشین گن فائر کر رہا
تھا، لانس نائک محفوظ کو دشمن کے بنکر کی طرف رینگتے دیکھ لیا۔ اس نے محفوظ کو آواز دے کر کہا کہ
رینگتے رہنا۔ میں تمہاری ٹانگوں سے اوپر سے فائر کر کے تمہیں کور کر رہا ہوں۔
نائک باز خان کی آڑ اچھی تھی۔ لانس نائک محفوظ نے اسے جواب دیا کہ فائر
کا رُخ ذرا بائیں کو کرو۔ دشمن گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے روکو۔
نائک باز خان نے فائر کا رُخ ذرا سا بدل دیا۔

لانس نائک محفوظ یقینی موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ اس وقت دشمن
نے دھوئیں کے گولے فائر کرنے شروع کر دیئے کیونکہ ہمارے جانباز جان پر کھیل
کر دشمن کی کئی گنیں خاموش کر چکے تھے اور دو تین بنکروں کو بھی ٹھنڈا کر دیا تھا۔
دشمن کو معلوم تھا کہ جو جوان اس قیامت میں بھی نہ پیچھے ہٹتے ہیں نہ ہتھیار
ڈالتے ہیں اور شہید ہوتے چلے جا رہے ہیں، وہ گاؤں لے کر ہی رہیں گے۔
چنانچہ دشمن نے گاؤں کو اور اپنی پوزیشنوں کو دھوئیں میں چھپانے کی کوشش
کی۔ لانس نائک محفوظ آخری بار اس حالت میں اپنے ساتھیوں کو نظر آیا کہ بنکر کے
قریب پہنچ کر اُسے سینے میں گولی لگی۔

اُسے احساس ہو گیا ہو گا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے اور زندگی کے
چند لمحے باقی ہیں۔ شہادت سے پہلے وہ اپنا فرض پُورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا
مگر اُس کے ہاتھ سے رائفل گر پڑی۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے وہ چل نہیں

سکتا تھا لیکن وہ بنکر کی طرف دوڑ پڑا اور بنکر کے اندر چلا گیا۔ اندر جو کچھ ہوا وہ دشمن کی زبانی پتہ چلا۔ اس نے مشین گن کے نمبر ٹو کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔ دوسرے بھارتی نے سنگین اس کے جسم میں اتار دی۔ وہ شہید ہو گیا لیکن جس بھارتی کی گردن اس کے ہاتھوں کے شکنجے میں آئی ہوئی تھی وہ بھی دم گھٹنے سے مر گیا۔

اس کی ایسی غیر معمولی جرأت نے سپاہی ثناء اللہ اور سپاہی محمد شفیع پر دیوانگی طاری کر دی۔ دونوں اپنی اپنی پوزیشنوں سے اٹھے اور جو بنکر سامنے آیا اس میں گھس گئے۔ ان کی لاشیں دشمن کے بنکروں کے اندر سے ملی تھیں۔ ان کے جسم سنگینوں سے قیمہ کئے ہوئے تھے۔

لانس نائک محمد محفوظ شہید راولپنڈی کے گاؤں پنڈ ملکاں کے رہنے والے مہربان خان کا بیٹا تھا۔ لمبے اور نہایت اچھے قد کاٹھ والا یہ خوبرو جوان نامی گرامی مڈل ویٹ باکسر تھا۔ جب دشمن کے بنکر سے اس کی لاش اٹھانے گئے تو ہمارے افسروں نے دشمن کی سکھ رجمنٹ کے کرنل پوری کو بتایا کہ یہ ہمارا باکسر تھا۔ کرنل پوری نے بے ساختہ کہا — "ہاں، یہ باکسر کی طرح لڑا ہے۔"

اسے پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر دیا گیا۔ اب اس کے گاؤں کا نام پنڈ ملکاں کی جگہ بستی محفوظ رکھ دیا گیا ہے۔

سپاہی ثناء اللہ شہید گوجرانوالہ کے گاؤں سنجر چیٹھہ کے رہنے والے محمد حسین کا بیٹا تھا۔ شہادت کے وقت اس کی عمر اکیس سال اور نو مہینے تھی اور سروس صرف دو سال۔

سپاہی محمد شفیع شاہ پور ضلع سرگودھا کے گاؤں ٹھٹھی منظالم کے رہنے والے برخوردار کا بیٹا تھا۔ شہادت کے وقت اس کی عمر پچیس سال تھی اور سروس چھ سال۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ دشمن گھیرا ڈالنے میں ناکام رہا تھا۔ ہمارے جانبازوں کی حالت اب یہ تھی کہ کوئی مشین گن نہیں رہی تھی۔ بہت سے جوان شہید اور زخمی ہو چکے تھے۔ کمپنی میں صرف چند ایک رائفلیں اور گرنیڈ رہ گئے

تھے۔ دشمن نے توپخانے کی گولہ باری میں قیامت خیز اضافہ کر دیا۔ اتنی شدید گولہ باری کے صرف دھماکے ہی انسانوں کو ختم کر دیا کرتے ہیں لیکن وہاں تو گولے انسانوں کے درمیان پھٹ رہے تھے۔ چار جوانوں کو سیدھے گولے لگے۔ ان کے جسم جل گئے۔ ان کی لاشوں کو بازوؤں سے بندھے ہوئے ڈسکوں سے پہچانا گیا تھا۔ اب تو ہر طرف گرد و غبار اور دھواں تھا۔ اس کے باوجود ہمارے جانباز پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کمپنی کو توپخانے کی گولہ باری کی مدد نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ کسی کو علم نہیں تھا کہ اپنے جوان کہاں ہیں، گاؤں کے اندر یا باہر۔ ملاپ کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ محدود سا میدانِ جنگ جو خون سے سرخ ہو گیا تھا، گرد و غبار میں چھپا ہوا تھا اور ہمارے جانباز آگے بڑھنے کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔

کیپٹن فضلِ معید نے صوبیدار محمد اکرم سے کہا کہ تمام زخمیوں سے کہو کہ نالے کی طرف نکلیں۔ یہ دونوں افسر شدید گولہ باری اور مشین گن فائرنگ میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ صوبیدار محمد اکرم زخمیوں کو دیکھ رہے تھے اور انہیں پیچھے نکلنے میں مدد دے رہے تھے۔

کیپٹن معید نے چلا چلا کر اور ہاتھوں کے اشاروں سے سب کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا مگر ایسے منظم طریقے سے جوانوں کو پیچھے ہٹایا کہ چند ایک جوان پیچھے آتے تھے اور پوزیشن لے کر دشمن پر فائر کرتے تھے۔ اس فائر کی آڑ میں کچھ اور جوان پیچھے آ جاتے۔ اس طرح ایک دوسرے کو فائر کا کور دے کر جوان پیچھے ہٹ کر نالے تک آ گئے۔

کیپٹن معید کسی زخمی کو پیچھے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ کام بے حد دشوار اور خطرناک تھا۔ جو جوان زخمی نہیں تھے یا کم زخمی تھے وہ معذور زخمیوں کو رینگ کر اور گھسیٹ کر پیچھے لائے یا پیٹھ پر ڈال کر رینگتے ہوئے نالے تک آئے۔ بعض زخمی از خود رینگ کر آئے۔ دشمن کی مشین گنیں اور توپیں ان پر فائر کر رہی تھیں۔ بعض جوانوں نے آٹھ نو سو گز فاصلہ پیٹ اور کہنیوں کے بل طے کیا۔

زخمیوں کو پیچھے لانے میں نائب صوبیدار محمد ریاض خان نے جان کی قربانی دے دی۔ وہ پلاٹون کمانڈر تھے۔ انہیں جب پیچھے ہٹنے کا حکم ملا تو اُنہوں نے اپنی پلاٹون کے زخمیوں، شہیدوں کی لاشوں اور باقی جوانوں کو پیچھے پہنچانے سے پہلے پیچھے جانے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے آواز دے دے کر اور ہاتھوں کے اشاروں سے اپنے جوانوں کو پیچھے ہٹانا شروع کیا اور ان کی راہنمائی بھی کرنے لگے۔ اس دوران ان کے کندھے پر گولیوں کی بوچھاڑ لگی مگر وہ اپنے زخمیوں کو پیچھے لاتے رہے حتیٰ کہ ایک گولے کا ٹکڑا ان کی پیشانی پر لگا جس سے وہ شہید ہو گئے۔ انہیں ستارۂ جراُت دیا گیا۔

نائب صوبیدار محمد ریاض شہید تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی کے گاؤں بُتر کے رہنے والے امیرداد کے بیٹے تھے۔ ان کی شہادت سے سعیدہ خانم کا سہاگ وطن پر قربان ہو گیا اور چھوٹے چھوٹے تین بچے (ایک لڑکا اور دو لڑکیاں) یتیم ہو گئے۔

حوالدار اصغر علی ایسے شدید فائر میں زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر اور رینگ رینگ کر پیچھے لاتے رہے۔ وہ جب چوتھے زخمی کو اُٹھانے گئے تو انہیں سینے میں گولی لگی مگر وہ رینگتے گئے اور چوتھے زخمی کو بھی پوسٹ تک لے آئے۔ جب وہ اس حالت میں کہ ان کے اپنے سینے سے گولی پار ہو چکی تھی اور وردی خون سے لال تھی، پانچویں زخمی کو لینے چلے تو پوسٹ کے ایک افسر نے اُنہیں روک لیا اور ہسپتال بھیج دیا۔ وہ اب زندہ وسلامت ہیں۔

سپاہی منظور حسین بھی زخمیوں کو اٹھانے میں اس طرح مدد دیتا رہا کہ پوزیشن بدل بدل کر دشمن پر فائر کرتا رہا تاکہ دشمن کی توجہ اس پر مرکوز رہے۔ تمام زخمی آ گئے تو بھی سپاہی منظور حسین پیچھے نہ آیا۔

دن کے بارہ بج گئے تھے۔ کمپنی کے زخمی اور ٹھیک جوان پیچھے آ گئے۔ معرکہ ختم ہو چکا تھا مگر سپاہی منظور حسین اور سپاہی بشیر احمد ابھی تک آگے تھے اور لڑ رہے تھے۔ اُنہوں نے پیچھے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ دشمن کی

اطلاع کے مطابق دونوں ایمونیشن ختم ہونے تک دشمن کے لیے مصیبت بنے رہے۔ پھر اُنہوں نے گرنیڈ پھینکے۔ آخر دشمن نے انہیں گھیر کر للکارا پھر بھی اُنہوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ دونوں پر کئی بھارتیوں نے سنگینوں سے حملہ کیا اور ان کے جسموں کو چھلنی کر دیا۔ ان کی لاشیں پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ یہ دونوں گاؤں کے اندر شہید ہوئے تھے اور دو بجے تک لڑتے رہے تھے۔

سپاہی بشیر احمد شہید ساہیوال کے گاؤں قطب شاہانہ کے رہنے والے غلام محمد کا بیٹا تھا۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۸ کے روز پیدا ہوا، اور ۷ ستمبر ۱۹۷۱ کے روز بھرتی ہوا اور تین ماہ بعد جبکہ وہ ابھی رنگروٹ تھا ایسی دلیری اور غیرت مندی سے لڑا کہ حکم کے باوجود پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ اسے تمغۂ جراُت دیا گیا۔

سپاہی منظور حسین جہلم کے گاؤں لنگر کے رہنے والے مولا بخش کا بیٹا تھا۔ یکم اپریل ۱۹۵۱ء کے روز پیدا ہوا۔ یکم اپریل ۱۹۷۰ء کے روز بھرتی ہوا۔ وہ بٹالین کا ایتھلیٹ تھا۔

ان دونوں کی شہادت کے بعد بھی جنگ جاری تھی۔ کمپنی کی نمبر ۳ پلاٹون کے کمانڈر حوالدار محمد شریف، سپاہی انتظار، سپاہی خالق اور سپاہی شریف کے ساتھ ابھی آگے ہی تھے۔ پل کنجری کے ایک پہلو میں سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ یہ چاروں دشمن پر فائر کرتے رہے۔ حوالدار محمد شریف شدید زخمی تھے۔ انہیں تین گولیاں لگی تھیں۔ ان چاروں کا ایمونیشن ختم ہو گیا تو سرکنڈوں کے جنگل میں رُوپوش ہو گئے۔ دشمن نے انہیں ہتھیار ڈالنے اور باہر نکلنے کے لیے بہت للکارا اور سرکنڈوں میں مشین گن فائرنگ بھی کی مگر ان غیرتمندوں نے اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کرنا قبول نہ کیا۔

دشمن میں اتنی جراُت نہیں تھی کہ سرکنڈوں میں جا کر انہیں پکڑ لاتا۔ اس نے سرکنڈوں کو آگ لگا دی۔ یہ ایسی صورت تھی کہ چاروں زندہ جل جانے کی بجائے باہر نکل آئے اور دشمن نے انہیں قید کر لیا۔

شام چار بجے کے قریب دشمن نے سفید جھنڈا لہرا دیا اور فائر بندی ہو گئی۔ اپنے شہیدوں کی لاشیں اٹھانی تھیں۔ بٹالین کے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر

نعمت اللہ اور کیپٹن فضلِ معید آگے گئے۔ ان کی ملاقات نمبر ۲ سکھ لائٹ انفنٹری کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل پوری سے ہوئی۔ کرنل پوری نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ اپنے علاقے میں پڑی ہوئی دشمن کی لاشیں کوئی نہیں اٹھانے دیا کرتا لیکن آپ کے جوان جس حیران کن بہادری سے لڑے ہیں اس کے پیشِ نظر ہم آپ کو لاشیں اُٹھانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ دشمن کے اس سکھ کرنل اور کچھ دوسرے افسروں نے ہمارے شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور لانس نائک محمد محفوظ شہید کے متعلق کرنل پوری نے کہا کہ یہ جوان ملک کے سب سے بڑے اعزاز کا حقدار ہے۔

وہاں سولہ لاشیں تھیں جن میں زیادہ تر گاؤں کے اندر تھیں اور تین دشمن کے بنکروں کے اندر۔ دشمن نے اپنی لاشیں اُٹھالی تھیں۔ یہ ثبوت تھا کہ ہمارے شہید دشمن کے بنکروں میں اور گاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے دشمن کو خوب نقصان پہنچایا تھا۔ دشمن اس قدر غصے میں تھا کہ انہیں زندہ پکڑنے کی بجائے انہیں سنگینوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

کیپٹن فضلِ معید کو ایسی جانبازانہ قیادت اور ذاتی شجاعت کے صلے میں ستارۂ جرأت دیا گیا۔ ۳ ردسمبر ۱۹۷۱ء کی شام انہوں نے ایک اور بٹالین کے ساتھ دشمن کے علاقے پر حملہ کر کے دشمن کی دو پوسٹوں پر قبضہ کیا تھا۔

اس معرکے کا حاصل کیا ہے؟ ــــ پُل کنجری پر دشمن کا قبضہ رہا اور پُل کنجری پوسٹ ہمارے پاس رہی مگر جو کامیابی حاصل کی گئی وہ زیادہ قیمتی ہے۔ دشمن کے افسروں سے ملاقات کے دوران پتہ چلا کہ وہ پُل کنجری تک اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں حکم ملا تھا کہ پُل کنجری کے سامنے سرحد کے اندر پاکستان کے گاؤں ٹھٹھہ تلاراں پر بھی قبضہ کر کے پاک فوج کو دُور پیچھے واہگہ کینال تک دھکیل دیا جائے۔ بھارتیوں کا مقصد یہ تھا کہ فائر بندی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاک فوج کو بھارتی علاقے سے نکالا جائے اور دباؤ برقرار رکھ کر اسے پاکستان کی سرحد کے دُور اندر تک دھکیل دیا جائے۔

اگر دشمن اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور ہمارے دستے پیچھے ہٹ

آتے تو دشمن بی آر بی تک بھی پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا اور یہ کوشش لاہور کے لیے بڑی خطرناک ہوتی۔ کیپٹن فضلِ معید اور اُن کے جوانوں نے جان کی بازی لگا کر سرحد سے دُور پُل کنجری میں ہی دشمن پر واضح کر دیا کہ لاہور تو دُور ہے اسے اب سرحد کی لکیر تک بھی نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ یہی اس معرکے کا حاصل ہے کہ دشمن پر واضح ہو گیا کہ نیم دائرے میں بنکروں اور مکانوں میں لگی ہوئی مشین گنوں اور ایسی شدید گولہ باری میں کود آنے والے پاکستانی جنہیں اپنی جان کا ذرّہ بھر خیال نہیں، ہمیں اپنی سرحد میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن نے سفید جھنڈا لہرا دیا اور پُل کنجری سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی۔

اور اس داستانِ شجاعت کا حاصل ایک روایت بھی ہے جو ہمارے جانبازوں نے کل کی پاک آرمی اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے خون سے لکھی ــــ اب دیکھنا یہ ہے، کیا قوم اس روایت کو اپنے سینے میں زندہ رکھے گی؟

آخری سبق

"جب میں پاک فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ سنٹر میں پہنچا تو اپنے باپ کو دل میں بہت گالیاں دیں۔ میں خاکی وردی پہن کر پورے پانچ سال اُسے دل میں گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک روز دشمن کی گولی میرے قریب سے بڑی ڈراؤنی آواز سے گزر گئی اور میرے مورچے کے اِردگِرد چار گولے پھٹے تو میرا باپ میرے لئے فرشتہ بن گیا۔"

یہ الفاظ پاک فوج کے ایک حوالدار کے ہیں جس نے مجھے اصل نام شائع نہ کرنے کی تاکید کی تھی۔ میں اسے صرف جوان لکھوں گا۔ جنگِ ستمبر کے دوران وہ سپاہی تھا۔

بھارتیوں نے کشمیر کے اندر پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کے کمانڈو جانبازوں کی کامیابی اور چھمب جوڑیاں سیکٹر میں پاک اور آزاد کشمیر افواج کے کامیاب حملے سے بوکھلا کر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح لاہور پر حملہ کر دیا، پھر تمام تر بکتر بند قوّت سے سیالکوٹ چونڈہ سیکٹر پر یلغار کر دی۔ بھارت کی قوّت کے مقابلے میں پاک فوج کی قوّت اتنی تھوڑی تھی کہ جنگ کے ماہرین اور مبصر تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اتنی تھوڑی سی فوج پاکستان کو بچا لے گی لیکن ساری دنیا نے دیکھا کہ اسی تھوڑی سی فوج نے پاکستان کو نہ صرف بچا لیا بلکہ بھارت کی جنگی قوّت کو ریزہ ریزہ کر کے کتنی برسوں کے لئے بیکار کر دیا۔

یہ ایک معجزہ تھا جو انسانوں نے کر دکھایا۔ اس معجزے کے پس منظر میں کئی ایک عناصر کارفرما تھے — جذبۂ حبُ الوطنی، روایات، ایمان کی قُوّت، تائیدِ ایزدی اور فنِ سپاہ گری میں مہارت یعنی اعلیٰ جنگی تربیت۔ ان تمام عناصر کا مرکب تھی شجاعت۔

شجاعت کا جب بھی ذکر آتا ہے تو بات صرف میدانِ جنگ یعنی اگلے مورچوں کی ہوتی ہے جہاں دونوں فوجیں ایک دوسرے پر چھوٹے بڑے ہتھیاروں اور ٹینکوں سے آگ برسا رہی ہوتی ہیں۔ یہاں شجاعت کے کارنامے اجتماعی ہوتے ہیں لیکن دشمن کی کمر توڑنے کے لئے اکیلے اکیلے افراد جو کارنامے کر دکھاتے ہیں اُن کا ذکر کم ہی سُننے میں آتا ہے۔ قوم کے یہ ہیرو گمنام رہتے ہیں۔ یہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کس طرح کی اور اُنہوں نے کس طرح جانیں قربان کیں۔ یہ کمانڈو، گوریلا اور لڑاکا گشتی دستوں کے جوان ہوتے ہیں جو دشمن کے توپخانے، ٹینکوں، گولہ بارُود کے ذخیروں وغیرہ کو تباہ کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر واپس نہیں آتے۔ وہ شہید ہوجاتے ہیں یا شدید زخمی حالت میں دشمن کے ہاتھ لگ جاتے ہیں یا دشمن سے چھُپ کر رینگ کر واپس آنے کی کوشش میں راستے میں ہی شہید ہو جاتے ہیں۔ وہ چونکہ الگ الگ ہوجاتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتے۔ جب پارٹی واپس آتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ کتنے واپس آئے ہیں اور کس حال میں آئے ہیں۔

ان گمنام جانبازوں میں دشمن کے علاقے میں دُور اندر جا کر پُل اُڑانے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان جانبازوں کا ہر مشن یقینی موت کا حامل ہوتا ہے لیکن ایک مشن ایسا ہے جسے ہم "خودکُش مہم" کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ اس مشن کی وضاحت یوں ہے کہ کشمیر جیسے پہاڑی علاقے میں بعض اوقات دشمن اپنا توپخانہ ایسی جگہ لا نصب کرتا ہے جو سامنے سے اپنے توپخانے کی گولاباری سے اور فضا سے طیاروں سے بھی محفوظ ہوتی ہے۔ توپخانہ ایسی بلند جگہ نصب کر دیا جاتا ہے جہاں سے وہ بہت وسیع علاقے

کو اپنی عملداری یعنی زد میں لے لیتا ہے۔ پیشقدمی اور جوابی حملوں کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں اور دشمن کارگر گولا باری کے ساتھ اپنے پیادہ اور بکتر بند دستوں کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

ایسے توپخانے کو تباہ کرنے یا اس کے قریب چھُپ کر اس پر اِکادُکا گولی چلا کر (جسے SNIPING کہتے ہیں) پریشان کرتے رہنے کے لئے چند ایک جانبازوں کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ ذرا تصوّر کیجئے کہ توپخانہ اگلے مورچوں کے عقب میں خاصی دُور ہوتا ہے۔ دائیں اور بائیں بھی مورچے ہوتے ہیں۔ توپخانے کی مسلح حفاظت کا نہایت خطرناک اہتمام ہوتا ہے۔ علاقہ بےحد دشوار گزار اور قدم قدم پر دشمن کے آگ اُگلتے مورچے۔ اس جہنّم میں کُود کر توپوں کے دہانے بند کرنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دو چار آدمیوں کو ایک آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ بند کرنے کے لئے بھیج دیا جاتے۔

بعض اوقات چار ہزار کی نفری وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جو کمانڈو یا لڑاکا گشتی پارٹی کے چار جوان حاصل کر لیتے ہیں۔ جنگِ ستمبر کے دوران پاک فوج کے جوانوں نے حیران کُن کارنامے کر دکھاتے تھے اور اپنی فوج کی کمی کو دشمن کے علاقے میں جا کر جانیں قربان کر کے پُورا کیا تھا۔

میں نے آپ کو جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء اور جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بیشمار کہانیاں سنائی ہیں۔ میں نے محاذوں اور مورچوں کی خاک چھانی ہے۔ بارک بارک، چھاؤنی چھاؤنی وطن کے اُن سرفروشوں کی شجاعت کی داستانوں کی تلاش میں گھُوما پھرا ہوں جو وطن کی قربان گاہ پر اپنی زندگی کے نذرانے دے کر دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں، اور اُن کی داستانیں بھی جو جسمانی طور پر عمر بھر کے لئے معذور ہو کر گمنام دیہات میں جا بیٹھے ہیں۔

میں شہیدوں کی ماؤں سے ملا ہوں۔ اُن جوان لڑکیوں سے بھی ملا ہوں جنہوں نے پاکستان کی آن پر اپنے سہاگ قربان کر دیئے ہیں۔ میں جرنیلوں سے ملا، بریگیڈ اور رجمنٹ کمانڈروں سے ملا اور ان کے انٹرویو شائع کئے ہیں۔

چند برس گزرے، میں نے ارادہ کر لیا کہ چھاؤنی میں گھومتے پھرتے پاک فوج کے کسی ایسے جوان کو پکڑ لوں گا جو جنگ ستمبر لڑا ہو اور اُسے کہوں گا کہ دوست آؤ کہیں بیٹھ جائیں۔ میں تم سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ تم بولتے چلے جانا، میں لکھتا چلا جاؤں گا۔ کوئی لفظ اِدھر اُدھر نہیں کروں گا۔

مجھے احساس تھا کہ ایسا انٹرویو اخباری دنیا کے دستور کے خلاف ہے۔ پرچے کو سجانے اور بارُعب بنانے کے لئے اِنٹرویو کسی بڑے جرنیل جنٹس، وزیر یا لیڈر کا شائع کیا جاتا ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قارئین پر ایڈیٹر کی شخصیت کا رُعب طاری ہو جاتا ہے لیکن مجھے پاک فوج کے جرنیل کہہ چکے تھے کہ جو بات تمہیں مورچے سے مل سکتی ہے وہ بریگیڈ اور ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک روز میں نے ایک جوان کو روک لیا۔ میں نے جب اپنا تعارف کرایا تو خوش قسمتی سے وہ میرا قاری نکلا۔ غائبانہ طور پر وہ مجھے جانتا تھا۔

میں نے مدعا بیان کیا تو وہ جھجک گیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا ——
"فوجی راز کی کوئی بات نہیں پوچھوں گا۔ تمہارے مُنہ سے کوئی بات نکل بھی گئی تو نہیں لکھوں گا۔ تم ستمبر کی جنگ کی کوئی بات سُنا دو۔"

ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ وہ گہری سوچ میں چلا گیا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ اُس نے جُھکا ہُوا سر اُٹھایا تو مجھے شک سا ہونے لگا جیسے یہ وہ آدمی نہیں جسے میں سڑک پر روک کر یہاں لایا تھا۔ وہ تو ہنس اور مُسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ چہرے پر ایسی شگفتگی تھی جیسے آنکھیں بھی مُسکرا رہی ہوں لیکن یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا تھا اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرے پر غم کے تاثرات کی پیلاہٹ تھی۔ اُس کی آنکھیں کہیں دُور دیکھ رہی تھیں اور ان کی سُرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

اُس نے لمبی آہ لی اور سر جھکا لیا۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات نے مجھے کہانی تو سنا ہی ڈالی تھی۔ میں پاک فوج کے جوانوں کے ان

تاثرات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ انہیں جب اپنے شہید ساتھی یاد آتے ہیں تو ان کی آنکھیں اور چہرے غم سے پیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس جوان کے تاثرات کی اچانک تبدیلی میرے لئے انوکھی نہیں تھی۔ مجھے اب اس سے یہ سُننا تھا کہ اس کے ساتھی کس طرح شہید ہوتے تھے۔

اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر اداس سی مُسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگا —— "جب میں پاک فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ سنٹر میں پہنچا تو اپنے باپ کو دل میں بہت گالیاں دیں۔ میں خاکی وردی پہن کر پورے پانچ سال اُسے دل میں گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک روز دشمن کی پہلی گولی میرے قریب سے بڑی ڈراؤنی آواز سے گزر گئی اور میرے مورچے کے ارد گرد چار گولے پھٹے تو میرا باپ میرے لئے فرشتہ بن گیا۔"

اُس نے کہا —— "پھر جُوں جُوں میرا پسینہ بہتا رہا، مجھ پر مٹی کی تہیں چڑھتی گئیں اور دن رات بغیر رُکے فائر کرتے کرتے ہاتھ سُوجتے گئے تو میرے باپ کی صورت مقدس ہوتی چلی گئی۔ اگر پہلی گولی میرے قریب سے نہ گزرتی اور اس کے گولے میرے پاس پھٹ کر مجھ پر اپنے وطن کی مٹی نہ پھینکتے تو میں ساری عمر اپنے باپ کو گالیاں دیتا رہتا جس کی باتیں سُن سُن کر میں سوچے سمجھے بغیر پاک فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑا اور چُپ ہو گیا۔ میں نوٹ بُک میں الفاظ گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔

وہ چُپ ہو گیا تو میں نے اُسے کہا —— "تمہارے جی میں جو آتا ہے بولتے چلے جاؤ۔ یہ مت سوچو کہ یہ بات اچھی ہے یا بُری۔"

"میرے والد صاحب پاکستان بننے سے ذرا پہلے انڈین آرمی سے حوالداری پنشن آئے تھے" —— اُس نے کہا —— "ہم دیہاتیوں کے لئے حوالداری بہت بڑا عہدہ ہوتا ہے۔ وہ جب پنشن آئے تھے اُس وقت میری عمر چھ سات سال تھی۔ میں اُن کے ساتھ چھاؤنی کے فیملی کوارٹروں میں رہا ہوں۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ فوجیوں کو وردی پہنے اکڑ اکڑ کر چلتے دیکھتا تو وہ مجھے بڑے اچھے

لگتے تھے۔ اُن کی پریڈ تو مجھے اتنی پسند تھی کہ صبح ہی صبح کوارٹر سے نکل کر پریڈ گراؤنڈ میں جا کھڑا ہوتا تھا۔ مجھے رائفل چلانے کا بہت شوق تھا....

"پاکستان بننے سے ڈیڑھ ایک سال پہلے والد صاحب کو پنشن مل گئی اور ہم گاؤں میں آ گئے.....

"والد صاحب زمینوں کی دیکھ بھال کے علاوہ دوسرا کام یہ کرتے تھے کہ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو اپنے پاس بٹھا کر اُنہیں جنگِ عظیم کی کہانیاں سُناتے رہتے تھے۔ وہ جنگِ عظیم کے دوران سمندر پار رہ آتے تھے۔ وہ چونکہ فوج کے سپلائی کے محکمے میں تھے اس لئے زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے وہاں کی جو باتیں وہ گاؤں والوں کو سنایا کرتے تھے وہ شاید ہر کسی کے لئے دلچسپ ہوں گی لیکن مجھے یہ باتیں سُن کر بہت لطف آتا تھا۔ وہ زیادہ تر عیاشی کی باتیں سُنایا کرتے تھے....

"بچپن میں تو مجھے صرف لطف آتا تھا جب میں بڑا ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہو گئی کہ میں بھی فوج میں بھرتی ہو کر والد صاحب کی طرح عیش کروں۔ میری عمر تیرہ چودہ سال ہو گئی۔ والد صاحب جب اپنے گرد گاؤں کے آدمیوں کو جمع کر کے جنگِ عظیم کی عیاشیوں کی باتیں سُناتے تھے تو اُنہیں بالکل خیال ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں بھی بیٹھا سُن رہا ہوں اور اب میں اِن باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں اور یہ باتیں میرے اندر گرمی پیدا کر رہی ہیں۔"

اس جوان کے والد صاحب جو باتیں سُنایا کرتے تھے، وہ میں طوالت سے بچنے کے لئے حذف کر رہا ہوں۔ بعض باتیں لکھنے کے قابل بھی نہیں ہیں مختصر یہ کہ اس کے والد صاحب فرانس اور مصر کی لڑکیوں کے قصے سُنایا کرتے تھے جنہیں وہ سگریٹوں، بسکٹوں، دُودھ کے ڈبوں اور چینی وغیرہ کے عوض پھانس لیا کرتے تھے۔ باتوں میں ڈبل راشن کا ذکر خاص طور پر کیا کرتے تھے جس میں سگریٹ، بسکٹ، دُودھ کے ڈبے اور شراب تک شامل تھی۔

"مجھے فوج کی زندگی اس طرح نظر آنے لگی جیسے وہاں عیش ہی عیش ہوتی ہے" — جوان نے والد صاحب کی سنائی ہوئی ساری باتیں سُنا کر کہا — "مجھے جو چیز بہت اچھی لگتی تھی وہ تھی ڈبل راشن۔ مجھے یاد تھا کہ جب والد صاحب سروس میں تھے اور ہم اُن کے ساتھ کوارٹر میں رہتے تھے تو وہ بہت ساری چینی اور ڈبے لایا کرتے تھے۔ ڈبوں سے گاڑھا گاڑھا میٹھا دُودھ بھی نکلتا تھا۔ بعض ڈبوں سے طرح طرح کے مربے اور بعض سے بڑی خوبصورت اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں نکلتی تھیں۔ مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ والد صاحب سپلائی کے محکمے (رائل انڈین آرمی سروس کور) میں حوالدار ہیں اور یہ گورا رجمنٹوں اور انگریز افسروں کا راشن ہے جو وہ سٹور سے اُڑا لاتے ہیں....

"گاؤں میں آ کر جب والد صاحب لوگوں کو ان ڈبوں کی باتیں سُناتے تھے تو وہ جھوٹی نہیں ہوتی تھیں مگر میں نے ڈبل راشن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو فوج میں بھرتی ہو کر معلوم ہوا کہ فوج جنگ میں جاتی ہے تو راشن کی مقدار بڑھا دی جاتی ہے۔ میں والد صاحب سے پوچھے بغیر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ڈبل راشن ڈبوں میں سے نکلنے والی کوئی بڑی لذیذ چیز ہوتی ہے....

"جنگ کے متعلق میں نے جو باتیں سُن رکھی تھیں وہ بہت خوفناک تھیں۔ بعض فوجی بتایا کرتے تھے کہ ہوائی جہاز بم گراتے ہیں تو انسانوں کی بوٹیاں اُڑ جاتی ہیں۔ توپوں اور ٹینکوں کے سامنے کوئی سپاہی زندہ نہیں رہتا لیکن جو باتیں والد صاحب سُناتے تھے وہ ڈبوں کے راشن کی طرح مزیدار ہوتی تھیں۔ وہ فرانس سے بھاگنے کی کہانی اس طرح سُنایا کرتے تھے جیسے ان کی ڈیوٹی ہی یہی تھی کہ جب دشمن نظر آتے تو بھاگ اُٹھو۔ اُن کی باتیں سُنو تو پتہ چلتا تھا کہ جنگ ایک کھیل تماشہ ہوتا ہے۔ جو مورچوں میں دبک کر بیٹھا رہے یا کہیں چھُپ کر بیٹھ جائے وہ عیش کرتا ہے۔ والد صاحب بھاگنے اور چھُپنے کے طریقے بھی بتایا کرتے تھے....

"فوجی زندگی میں صرف جنگ کا ہی ڈر ہوتا ہے۔ والد صاحب نے اپنی کہانیاں سُنا سُنا کر جنگ سے بچنے کے طریقے بھی بتا دیتے تھے۔ اس طرح

فوجی زندگی میرے لئے بہشت بن گئی۔ آپ شہری لوگ گاؤں کی زندگی کو بہت
خوبصورت سمجھتے ہیں۔ اگر آپ گاؤں میں رہ کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ
کتنی سخت زندگی ہے۔ رات کے پچھلے پہر ہل چلانے کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے۔
گرمیوں کی دوپہر ہل چلاتے گزرتی ہے۔ ڈھور ڈنگر کو سنبھالنا بہت ہی سخت
کام ہے۔ سب سے زیادہ مشکل کام فصلوں کی کٹائی ہے....

"گاؤں کے بچے شروع سے ہی ان سختیوں کے عادی ہوجاتے ہیں
اس لئے بڑے ہوکر وہ مویشیوں کے ساتھ مویشی بن کر خوش رہتے ہیں۔
میں نے بچپن والد صاحب کے ساتھ فوجی کوارٹروں میں گزارا تھا۔ اس کے
بعد والد صاحب کی مزیدار باتوں نے میرا دل گاؤں میں لگنے نہ دیا اور میں
فوج میں بھرتی ہونے کے لئے بے قرار رہنے لگا....

"۱۹۵۹ء میں خدا نے میری آرزو پوری کی۔ میں نے والد صاحب سے
اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مخصوص فوجی طریقے سے گردن تان کر بولے
—'شاباش جوان! تم سولہ آنے ٹھیک فیصلہ کیا۔ جاؤ بھرتی ہوجاؤ۔ چنگ رہو۔
تم صوبیداری پنشن گھر آتے گا'— والد صاحب نے سارے گاؤں میں یہ
خبر مشہور کردی کہ میرا بیٹا سپلائی کور میں بھرتی ہونے کے لئے جارہا ہے....

"گاؤں کے لوگ عجیب ہوتے ہیں۔ برادری میں کسی کو سر اُٹھاتے
دیکھیں تو طرح طرح کے ناجائز طریقوں سے اُس کا سر دبانے کی کوشش
کرتے ہیں۔ اگر کسی کا سر نیچا نہ کرسکیں تو اپنا سر اُونچا کرلیتے ہیں۔ ہماری
برادری نے جب سُنا کہ میں بھرتی ہونے جارہا ہوں تو برادری کے ایک
گھرانے نے اپنا بیٹا مجھ سے پہلے بھرتی ہونے کے لئے شہر بھیج دیا....

"والد صاحب مجھے شہر لے گئے اور مجھے بھرتی کرا دیا۔ جب میں ٹریننگ سنٹر
کے لئے روانہ ہونے لگا تو اُنہوں نے مجھے دو شلواریں اور دو قمیضیں سلوا دیں۔
گاڑی پر چڑھانے کے لئے خود ساتھ آئے اور شہر سے مجھے نئے بُوٹ لے
دیتے اور میری دیہاتی جُوتی گھر لے گئے۔ میں بہت خوش تھا۔ سب سے بڑی
خوشی یہ تھی کہ ڈبل راشن ملے گا مگر معلوم نہیں تھا کہ ڈبل راشن کیا ہوتا ہے۔

دوسری خوشی یہ کہ میں سپلائی کور میں جارہا ہوں جہاں سیب، ناشپاتی اور
ہر طرح کے پھل فروٹ کے مربّوں کے بند ڈبے ملیں گے۔ اگر سیدھے ہاتھ
نہ ملے تو والد صاحب کی طرح سٹور سے اُڑا لیا کروں گا....

"لو جناب عالی، ہم ٹریننگ سنٹر میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک حوالدار ملا
جس نے پہلا سوال یہ کیا —'تم نیا جنگلی ہے؟'— میں نے کہہ دیا —
'ہاں جی'— تو اُس نے ایک بارک کی طرف اشارہ کرکے کہا —'وہاں
چلے جاؤ۔ تم کو اُدھر اپنے مافق بہت جنگلی ملے گا'— میں چل پڑا— پیچھے
سے حوالدار کی سخت کڑوی اور غصیلی آواز آئی —'ڈبل سے جانگلی!—
گبن کھوتی کا مافق مت چلو۔ یہ ٹریننگ سنٹر ہے۔ چک پچاسی شمالی نہیں ہے'....

"میں ڈبل کا نام سُن کر خوش ہوگیا کہ اس بارک میں ڈبل راشن ملے گا۔
میں آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ اچانک پیچھے سے حوالدار دوڑتا آیا۔ اُس نے مجھے
بازو سے پکڑا اور تیز دوڑنے اور اپنے ساتھ مجھے دوڑانے لگا۔ کہنے لگا
—'اس مافق ڈبل۔ ادھر ہر کام ڈبل سے کرو۔ ادھر تمہارا مائی باپ کا بیاہ
شادی نہیں ہے۔ یہ پنجاب رجمنٹ کا ٹریننگ سنٹر ہے'— اور مجھے بارک
کے برآمدے تک لے گیا....

"میرا دم پھول گیا تھا۔ میں نے رُک کر اُس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا
—'بھاجی! یہ سپلائی کور کا ٹریننگ سنٹر نہیں ہے؟'— حوالدار بولا —
'بکومت۔ ہم بھاجی نہیں ہے۔ ہم کو اُستاد بولو۔ رینک حوالدار.... اب تم
بارک کے اندر جاتے گا۔ جو خالی چارپائی نظر آتے گا اس پر تم قبضہ کرے گا۔
اس کے نیچے تم کو لکڑی کا بکسا ملے گا۔ تیار ہوجاؤ.... گوپ'— میں کھڑا اُس کا
مُنہ دیکھتا رہا۔ اس نے بندوق کی طرح پھر کہا —'گوپ'— میری ہنسی نکل
گئی۔ حوالدار نے کہا —'اچھا ہنستا ہے۔ ہم ابھی تمہارا ہاسا ٹھیک کرتا ہے'—
اُس نے کہا —'پورا بارک کا ایک چکر ڈبل سے.... گوپ'— میں پھر بھی
کھڑا ہی رہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا گوپ کیا ہوتا ہے....

"اتنے میں ایک آدمی بڑے اچھے سویلین کپڑے پہنے ہوتے آگیا۔

حوالدار نے اُسے سیلوٹ کیا تو اس آدمی نے حوالدار سے کہا — 'حوالدار فضل دلوا تمہیں یاد ہے جب تم گاؤں سے بھرتی ہو کر یہاں آتے تھے تو یہاں میں حوالدار تھا؟ تم بھی اسی کی طرح کے جانگلی تھے۔ جانے دو اسے' — حوالدار نے کہا —

'صوبیدار صاحب جی! یہ جانگلی ڈبل سے اور گوپ نہیں جانتا' — صوبیدار نے ہنس کر کہا — 'تم بھی نہیں جانتے تھے' — اور اُس نے مجھے کہا — 'جا کاکا، اندر چلا جا' — اور میں حیران و پریشان بارک میں چلا گیا ....

"مجھے جس بارک میں بھیجا گیا وہ بڑی لمبی بارک تھی۔ چارپائیوں کی دو قطاریں بچھی ہوئی تھیں۔ کئی چارپائیاں خالی تھیں۔ ایک پر میں نے اپنی دری اور کھیس رکھ دیا۔ بارک میں مجھ جیسے بہت سے جانگلی جمع تھے۔ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کئی میرے پاس آ بیٹھے۔ ہر ایک نے یہی پُوچھا — 'ضلع کونسا ہے؟ .... تحصیل؟ .... گاؤں؟' — جب میں نے تینوں سوالوں کا جواب دیا تو اُنہوں نے پھر پوچھا — 'خاص؛ یا اِدھر اُدھر؟' — میں نے کہا — 'بالکل خاص' ....

"تھوڑی دیر بعد بارک میں ہلچل سی مچ گئی۔ سب باہر نکلنے لگے۔ دو جوان مجھے بھی باہر لے گئے اور ہم سب لنگر میں جا بیٹھے۔ بعض کے پاس پلیٹیں تھیں جو اُنہوں نے دال سے بھروالیں اور دو دو روٹیاں لے کر کھانے بیٹھ گئے۔ ایک ٹولی نے مجھے بھی اپنے پاس بلا کر کہا — 'تمہارے پاس پلیٹ نہیں ہے تو جاؤ چپاتیاں لے آؤ اور ہمارے ساتھ کھالو' — میں دو روٹیاں لے آیا اور جب دال کھانے بیٹھا تو اُبکائی کی طرح یہ سوال بار بار میرے مُنہ میں آکر واپس چلا جاتا کہ ڈبل راشن کب ملے گا؟ ....

"دال روٹی کھا چکے تو میرے گاؤں کا وہ لڑکا مل گیا جو مجھ سے دو تین روز پہلے بھرتی ہو کر آگیا تھا۔ میں اُس کا اصل نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ اُسے اشرف، اکرم، نتھو، جمعہ جو جی چاہے کہہ لیں .... چلو اشرف کہہ لیتے ہیں .... وہ مجھے بڑے پیار سے ملا۔ میں خوش ہُوا کہ ایک انسان تو کم از کم ایسا مل گیا ہے جو اجنبی نہیں ہے۔ ہم بارک میں آگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں

ہوتی رہیں۔ رات ہو گئی تو باہر وِسلیں بجنے لگیں اور آوازیں آنے لگیں — 'چلو او تے نئے رنگروٹ۔ باہر نکلو گنتی کے واسطے' — ہم آہستہ آہستہ اُٹھے تو دو آدمی اندر آکر چلّانے لگے — 'ڈبل سے جانگلی۔ ڈبل سے' — میں نے بے اختیار سا ہو کر اشرف سے پوچھا — 'ڈبل راشن ملے گا؟' — وہ سمجھ نہ سکا۔ کہنے لگا — 'نہیں۔ جب یہ لوگ راشن دیتے ہیں تو ڈبل سے نہیں دیتے۔ راشن دے کر ڈبل سے نکال لیتے ہیں۔ دوڑا دوڑا کر' .... وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ میں اُس کی نہ سمجھ سکا۔ میں نے پوچھا — 'راشن کسے کہتے ہیں؟' — اُس نے کہا — 'ابھی جو لنگر سے کھایا ہے، دال روٹی' — 'اور ڈبل کیا ہوتا ہے؟' — اس نے جواب دیا — 'دوڑو' — میں نے پوچھا — 'ڈبل راشن کیا ہوتا ہے؟' — اُس نے جواب دیا — 'راشن کھاؤ اور دوڑو' — میں سوچ میں پڑ گیا اور چُپ ہو گیا ....

"ہماری گنتی ہوئی۔ آکر سو گئے۔ رات شاید آدھی گزری ہو گی کہ بارک میں پھر شور ہونے لگا — 'اُٹھو او تے جانگلی لوگ ڈبل سے۔ ڈبل سے اُٹھو' — میری آنکھ کھلی تو کسی نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹا اور کہا — 'جلدی اُٹھو۔ فالم ہو جاؤ۔ فالم۔ ڈبل سے۔ ڈبل سے' — اور ذرا سی دیر میں ہم باھر نکل گئے۔ کل والا حوالدار چیخ چلّا رہا تھا — 'اِن تھری۔ اِن تھری، تین تین۔ آگے پیچھے' — میں اُس کے قریب سے گزرا تو اُس نے مجھے دھکا دے کر کہا — 'تم گبّن کھوتی۔ ریئر رینک میں چلا جا۔ ڈبل سے' ....

"ہمیں تین تین کر کے دائیں کو موڑ دیا گیا اور 'کوئیک مارچ' کے حکم پر اگلے تین رنگروٹ چلے تو ہم پیچھے والے بھی شلواریں، دھوتیاں اور لاچے پہنے ہوئے چل پڑے۔ حوالدار چلّانے لگا — 'لیف۔ ٹریٹ لیف۔ ٹریٹ' — ہم چلتے رہے۔ اُس نے بڑے غصّے سے کہا — 'لیف کھبا۔ ٹریٹ سجا۔ لیف کھبا۔ ٹریٹ سجا' — اور ہم کھبا سجا کی تال پر چلتے

پہ چلے گئے۔ ابھی اندھیرا تھا۔ ہمیں ایک جگہ روک کر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہوئی پھر سورج نکلا اور جب ہم بارک میں 'لیف۔ ٹریٹ' کر تے واپس آتے تو ہمارے سروں پہ ایک ایک وزنی گٹھڑی تھی جس میں ہماری نئی وردی تھی ....

"لو جناب عالی، آپ کو لمبی باتیں کیا سُناؤں۔ معلوم نہیں آپ نے فوجی زندگی دیکھی ہے یا نہیں۔ وردی پہننے کی دیر تھی کہ ہماری زندگی ڈبل سے گزرنے لگی۔ خدا نے ہمیں ٹریننگ دینے کے لئے جو حوالدار زمین پر اُتارا تھا اُس کی زبان پر ہر وقت یہی الفاظ ہوتے تھے — 'ڈبل سے جانگلی۔ گبّن کھوتی کا مافق مت چل۔ اِدھر تمہارا مائی باپ کا بیاہ شادی نہیں ہے۔ یہ پنجاب رجمنٹ کا ٹریننگ سنٹر ہے' — ڈبل سے، ڈبل سے، سُن سُن کر کان پک گئے مگر والد صاحب کا ڈبل راشن اور دُودھ اور پھل فروٹ کے ڈبّے نظر نہ آتے۔ میرے ساتھی رنگروٹوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ سپلائی کور نہیں انفنٹری کا ٹریننگ سنٹر ہے ....

"اس حوالدار نے تین مہینے پریڈ گراؤنڈ میں ہمارا وہ حال کر دیا کہ ہمیں اپنی ولدیت بھول گئی۔ جب اُس کا عرصہ پورا ہو گیا تو ہمیں ایک اور حوالدار کے حوالے کر دیا گیا۔ اُس روز پہلے حوالدار نے ہمیں لکچر دیا۔ اُس نے کہا — 'سُنو جوان! آج تم ہم سے جُدا ہو جائے گا۔ ہم تم کو بہت گالی دیا۔ بہت تنگ کیا۔ غلطی قصور بخش دینا۔ ہم کس واسطے گالی بکتا۔ اس واسطے کہ تم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ کی زمین کا والی وارث ہے۔ تمہارا مقابلہ سکھ کے ساتھ ہوگا۔ ڈوگرہ، مرہٹہ اور گورکھا کے ساتھ ہوگا۔ تم کو معلوم نہیں وہ سب لڑنے والا قوم ہے۔ اِس حرامی قوم نے ہمارا مائی بہن اور بچی کا عزّت خراب کیا۔ تم اس کا بدلہ لے گا۔ ہم تم کو اس واسطے گالی بکا کہ تم ٹھیک سے مسجد اور قرآن مجید کا رکھوالا بن جاؤ۔ تم ہم کو دل میں بولے گا کہ یہ حوالدار بڑا کافر تھا۔ تم کو جو نیا حوالدار ملے گا وہ ہم سے زیادہ کافر ہوگا اور جب تم اصل کافر کے سامنے لڑنے کے واسطے جائے گا تو

تم بولے گا۔ اوہ، ہمارا ٹریننگ سنٹر والا حوالدار اصل مسلمان تھا' ...

"بھائی صاحب! اُس وقت ہم پر اپنے حوالدار کے لکچر کا کوئی اثر نہیں ہُوا تھا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ چلو اس سے جان چھُوٹی۔ ہو سکتا ہے دوسرا حوالدار رحم دل ہو لیکن ساڑھے پانچ سال بعد جب اصل کافر نے ہمارے ملک پر حملہ کیا تو یہی حوالدار میری بٹالین میں نائب صوبیدار تھا۔ اُس نے ...."

جوان کی ہچکی سی نکل گئی اور اُس نے سر جُھکا لیا۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس نے لمبی آہ لی اور دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگا — "ستمبر کا مہینہ قریب آتا ہے تو وہ سارے ساتھی سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں جو وطن کی خاک میں خاک ہو گئے۔ بھائی صاحب! میں اُنہیں یاد کرتا ہوں تو شرم سے سر جُھک جاتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ وہ مجھ سے آگے نکل گئے ہیں۔ میں آنسو بہانے کے لئے پیچھے رہ گیا۔ اب یاد آتا ہے کہ وہ پہلا حوالدار اصل مسلمان تھا۔ صرف پندرہ گز کے فاصلے سے اُس نے دشمن کے ٹینک پر راکٹ لانچر فائر کیا تھا۔ ٹینک اُس کے اُوپر آ کر بیٹھا، اور اُس کی لاش بھی نہ ملی۔ جب میں آپ کو بتاؤں گا کہ اُس نے کس جگہ جا کر ٹینک پر راکٹ فائر کیا تھا تو آپ کہیں گے کہ نہیں یہ جھوٹ ہے۔"

اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور رقّت پر قابو پا کر بولا — "میں آپ کو ٹریننگ سنٹر کی باتیں سُنا رہا تھا جب میں واقعی جانگلی تھا اور ابھی تک ڈبل راشن کا انتظار کر رہا تھا۔ اِس حوالدار سے جان چھُوٹی تو اس سے زیادہ ظالم حوالدار کے پاس جا پھنسے۔ بیونٹ (سنگین) ٹریننگ شروع ہو گئی۔ ہمارے سامنے بھُوسے سے بھری ہوئی بوریاں رکھی ہوتی تھیں۔ ایک زمین پر اور ایک فریم میں کھڑی ہوتی تھی۔ انہیں ڈمی کہتے تھے۔ ان کے چاروں کونوں پر سیاہ نشان ہوتے تھے جو دشمن کا دایاں کندھا، بایاں کندھا، دایاں کُولہا اور بایاں کُولہا کہلاتے تھے۔ یہ ٹریننگ بڑی ظالم تھی۔ رات

سوتے وقت بھی کان میں یہی آواز گونجتی رہتی تھی ـــ کھڑی ڈمی، بایاں کولہا، پینٹھ۔ بڈراف۔ ایڈبنس۔ پڑی ڈمی۔ دایاں کندھا۔ پینٹھ۔ بڈراف۔ ایڈبنس، ـــ ہم رائفل کے آگے سنگین چڑھاتے، بہت تیزی سے ان ڈمیوں کے سیاہ نشانوں پر بیونٹ کا وار کرتے، بیونٹ پیچھے کرتے۔ آگے بڑھتے پھر زمین پر پڑی ڈمی کے بنائے ہوئے نشان پر بیونٹ مارتے، نکالتے اور آگے بڑھتے تھے۔ ذرا سستی ہو جاتی تو پیچھے سے حوالدار کی لات یا ہیزری سٹک پڑتی تھی....

"پہلے روز جب میں نے کھڑی ڈمی میں بیونٹ مار کر نکالا اور آگے بڑھا تو مجھے والد صاحب یاد آگئے لیکن اُس وقت میں والد صاحب نہیں، اُنہیں باپ کہا کرتا تھا۔ میں نے دل میں باپ کو گندی گالی دی اور 'پڑی ڈمی' پر اس طرح غصے سے بیونٹ مارا جیسے یہ بوری نہیں میرا باپ ہے جس کی مزیدار باتوں کے دھوکے میں میں بھرتی ہو گیا تھا اور جس نے مجھے سپلائی کور کی بجائے انفنٹری میں بھرتی کرا دیا تھا....

"جب ہیزری سٹک کی ٹریننگ شروع ہوئی تو نانی یاد آگئی۔ استاد نے بندر بنا دیا اور میں گبن کھوتی نہ رہا۔ اس کے بعد ٹریننگ سخت سے سخت ہوتی گئی۔ والد صاحب کے خط آیا کرتے تھے جو میں پڑھ کر غصے سے پھاڑ دیا کرتا تھا صرف ماں کا خیال تھا۔ اُس کی خاطر کبھی کبھی خط کا جواب

1.POINT 2.WITHDRAW 3.ADVANCE

دے دیا کرتا تھا۔ والد صاحب کو میں دشمن سمجھتا تھا....

"خدا خدا کر کے ٹریننگ کا عرصہ پورا ہو گیا۔ میں نے بڑی بددلی سے ٹریننگ کی۔ کسی کھیل میں حصہ نہ لیا۔ فوجی تعلیم کا کوئی امتحان پاس نہ کیا حالانکہ کسی کھیل میں مہارت اور فوجی تعلیم ترقی میں بہت مدد دیتی ہے لیکن میں تو عمر قید کے قیدی کی طرح باپ کے گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ ایک دو دفعہ بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن ایک پرانے سپاہی نے بتایا کہ فوج کا بھگوڑا فوراً پکڑا جاتا ہے اور سیدھا جیل خانے بھیج دیا جاتا ہے....

"ٹریننگ ختم کر کے چھٹی ملی۔ گھر گیا تو باپ خوشی سے ناچتا کودتا پھرتا

تھا لیکن میں اُسے مُنہ بھی لگانے کو تیار نہ تھا۔ اگر وہ میرا باپ نہ ہوتا تو اُسے کھڑی ڈمی بنا کر دائیں اور بائیں کولہے میں بیونٹ گھونپ دیتا۔ جب چھٹی ختم ہوتی تو گھر سے نکلتے وقت بے اختیار آنسو نکل آئے۔ میری ایک ہی بہن ہے۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگی اور ماں بھی رو پڑی۔ میرے باپ نے یہ منظر دیکھ کر میرے ٹریننگ سنٹر والے پہلے حوالدار کی طرح کہا ـــ 'یہ ٹھیک نہیں، تم چلو، جوان چلو۔ ڈبل سے' ـــ اور میں باپ کو قہر بھری ہوئی نظروں سے دیکھتا گھر سے نکل آیا۔ گاؤں کی زندگی بہشت کی طرح نظر آتی تھی مگر مجھے نظر نہ آنے والی زنجیریں ڈال کر اور گھسیٹ کر کوئی لے جا رہا تھا....

"میرے گاؤں کا رہنے والا اشرف البتہ خوش تھا۔ اُسے فوجی نوکری راس آگئی تھی۔ گاؤں سے ہم اکٹھے نکلے۔ میں رو رہا تھا اور وہ ہنس رہا تھا۔ دیہات میں یہ رواج ہے کہ جوں ہی کوئی جوان نوکر ہو جاتا ہے اُس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ ماں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک جگہ میرے رشتے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُس نے یہ بھی بتایا کہ اشرف کے ماں باپ میری بہن کا رشتہ مانگتے ہیں اور میرے والد صاحب رضامند ہیں کہ اشرف کو رشتہ دے دیا جائے....

"میں نے جب اپنے باپ کی رضامندی کے متعلق سُنا تو میں نے ماں سے کہا کہ ابھی ہاں نہ کہنا۔ میں اشرف کو اچھی طرح دیکھ بھال لوں۔ اشرف میں کوئی عیب نہیں تھا لیکن میں اپنے باپ کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اُس نے جس طرح مجھے فوج میں پھنسا دیا ہے اسی طرح میری بہن کو غلط گھر میں پھنسا دے گا....

"ہم پلٹن میں چلے گئے۔ وہاں ٹریننگ سنٹر والی سختی نہیں تھی لیکن میرے باپ والا ڈبل راشن یہاں بھی نظر نہ آیا، نہ وہ عیش نظر آئی جس کی پُرلطف کہانیاں باپ سنایا کرتا تھا۔ اب میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ باپ کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا رہوں۔ مجھے اپنے کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی

بلکہ وردی اور فوج سے نفرت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھے پلٹن کے گھامڑ سپاہیوں میں شامل کر دیا گیا۔ گھامڑ سپاہی ساری سروس سپاہی رینک میں کر جاتے ہیں۔ پلٹن میں جو گندا کام ہو وہ انہیں دیا جاتا ہے۔ انہیں پلٹن کے نامور کھلاڑیوں کی مالش اور خدمت خاطر پر لگایا جاتا ہے اور ان کی حالت وہی ہوتی ہے جو گاؤں میں کمین ذات کی ہوتی ہے ....

"پانچ سال گزر گئے۔ ۱۹۶۵ء کا سال شروع ہو گیا۔ میرے بعض ساتھی پکے لانس نائیک اور ایک نائک بن چکا تھا۔ اشرف لانس نائک تھا لیکن میں ابھی سپاہی تھا اور مجھے ساری سروس سپاہی رہنا تھا۔ اشرف اب میرا دوست نہیں دشمن تھا کیونکہ میں نے اُسے اپنی بہن کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اشرف کو پتہ چل گیا تھا کہ میرے انکار کی وجہ سے اُسے رشتہ نہیں مل رہا۔ اُسے کسی اور گھر سے رشتہ لے لینا چاہیئے تھا لیکن اُس نے کہا تھا کہ میں یہی رشتہ لوں گا۔ چنانچہ جب وہ چھٹی جاتا تو میرے والد صاحب کے پاس بیٹھ کر میرے خلاف اس طرح باتیں کرتا جیسے وہ میرا ہمدرد ہے اور اُسے میری ذات سے بہت زیادہ پیار ہے۔ وہ دراصل میرے باپ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آپ کا بیٹا بیوقوف ہے اس لئے اُس کی بات نہ مانو۔ یہ باتیں مجھ تک پہنچیں تو پلٹن میں میری اور اشرف کی لڑائی ہو گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو لہولہان کر دیا ....

"رپورٹ ہوئی تو مجھے سات روز کے لئے کوارٹر گارد میں بند کر دیا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ میں گھامڑ سپاہی تھا جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ میرے مقابلے میں اشرف لانس نائیک ہو چکا تھا اور اتنا چُست اور ہوشیار تھا کہ عہدیدار اور افسر اُسے پسند کرتے تھے۔ اُس کا جھوٹ بھی سچ اور میری قسمیں بھی جھوٹی تھیں۔ گاؤں میں ایسی دشمنی پر قتل ہو جایا کرتے ہیں۔ پلٹن میں صرف لڑائی ہوئی اور مجھے سزا مل گئی۔ میں سزا بھگت کر نکلا تو کسی نے مجھے بتایا کہ اشرف کہتا ہے کہ میں اسے ایسے طریقے سے قتل کروں گا کہ کسی کو اصل قاتل کا پتہ نہیں چل سکے گا ....

"میں سیدھا اشرف کے پاس چلا گیا اور بھری بارک میں کھڑے ہو کر کہا 'گرائیں، قتل کرنا ہے تو مردوں کی طرح سامنے آ' ـــــ بیچ بچاؤ ہو گیا اور لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دشمنی پکی ہو گئی۔ میں نے اُسی روز خط لکھ دیا کہ بہن کا رشتہ لٹکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اشرف کے ماں باپ کو صاف جواب دے دو اور جہاں کہیں سے پیغام آتے ہاں کہہ دو ....

"تھوڑے دنوں بعد رن کچھ میں گڑبڑ ہو گئی۔ ہماری پلٹن کو تیاری کا حکم مل گیا .... رن کچھ کی گڑبڑ ختم ہو گئی اور میں نے خُدا کا شُکر ادا کیا لیکن ہمیں اس چھاؤنی میں سے ایک اور جگہ لے گئے جو سرحد کے قریب تھی۔ میں آپ کو بالکل نہیں بتاؤں گا کہ ہم کہاں گئے اور وہاں سے کہاں گئے۔ آپ کو انڈیا کے ساتھ ہمارے لڑائی جھگڑے سے دلچسپی ہے۔ وہ سارا قصہ سُنا دوں گا۔ کسی جگہ، کسی افسر اور کسی جوان کا نام نہیں بتاؤں گا"

میں نے اُس کی تائید میں کہا کہ مجھے کسی ایک محاذ سے دلچسپی نہیں۔ میرے لئے ٹیٹوال اور راجستھان، فاضلکا اور جسّڑ ایک جیسے ہیں۔ ہر محاذ پر نعرہ ایک اور جذبہ ایک تھا۔ مجھے کسی محاذ کا نام لئے بغیر کوئی واقعہ سُنا دو۔ ایسے کارنامے ہر محاذ پہ ہوئے ہیں۔

"رن کچھ کی گڑبڑ کے دوران میرے ٹریننگ سنٹر والا پہلا حوالدار سنٹر سے تبدیل ہو کر پلٹن میں آ گیا۔ وہ اب نائب صوبیدار تھا۔ اُسے میری پلاٹون دے دی گئی۔ اشرف میری کمپنی کی دوسری پلاٹون میں تھا۔ نائب صوبیدار نے پلاٹون کی کمان لے کر دو تین دنوں میں دیکھ لیا کہ میں کس قسم کا سپاہی ہوں۔ اُس نے پہلا فقرہ یہ کہا ـــــ "تم جانگلی، ابھی تک گبّن کھوتی ہے۔ شرم کر بے غیرت! پنجاب رجمنٹ کا بھنگی تم سے چیاستی چنگ ہے۔ اب انڈیا سے لڑائی لگنے والا ہے پھر تم کو معلوم پڑ جائے گا کہ تمہارا ماں کا دودھ خالص تھا یا ناخالص" ـــــ لیکن مجھے نہ تو شرم آتی نہ غیرت۔ میں نے تین مہینوں سے بہانہ بنا رکھا تھا کہ ٹخنے کے اندر درد ہوتا ہے جو بڑے بوٹ پہننے سے بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بُوٹوں کی معافی دے دی تھی ....

"اس نائب صوبیدار کو تجربے نے بتایا تھا کہ مجھ جیسے سپاہی بہانہ ساز ہوتے ہیں۔ اُس نے بڑے بوٹ پہننے کا حکم دیا۔ میں نے بُوٹ پہن لئے تو اُس نے حکم دیا ۔۔۔ 'مارک ٹیم'۔۔۔ میں نے جواب دیا کہ ٹخنہ دُکھتا ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بُوٹوں کی معافی دے رکھی ہے۔ نائب صوبیدار کو معلوم تھا کہ وہ ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کر کے جُرم کر رہا ہے لیکن اُس نے مجھے بڑے بُوٹ پہنا کر ڈبل مارچ کرایا اور خوب بھگایا۔ میں بیٹھ گیا اور ٹخنہ پکڑ کر ہائے ہائے کرنے لگا۔ نائب صوبیدار نے کہا ۔۔۔ 'پروا نہیں۔ ہم اپنا کورٹ مارشل کرالے گا پر تم کو بندے کا پُتّر بنا دے گا' ۔۔۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور حکم دیا ۔۔۔ 'کل سِک رپورٹ کرو اور اُدھر بولو سَر، ہمارا گِٹّہ (ٹخنہ) سولہ آنے ٹھیک ہوگیا ہے۔ ہم بُوٹ پہنے گا' ۔۔۔ پھر اُس نے میرا ایک کان پکڑ کر کہا ۔۔۔ 'تمہارا دشمن انڈیا ہے، لانس نائک اشرف نہیں ہے۔ ابھی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ نہیں تو ہم تم کو مارٹر گن بنا دے گا'۔۔۔۔

"آپ اگر مارٹر گن کو پلیٹ اور بائی پاڈ پر دیکھیں تو آپ کو ہنسی آجائے گی کہ نائب صوبیدار مجھے مارٹر گن بنانا چاہتا تھا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ سکول میں اُستاد بچے کو مُرغا بناتے ہیں اور ہماری پلٹن میں یہ نائب صوبیدار ہمیں مارٹر گن بنایا کرتا تھا یعنی نالی اُوپر، آسمان کی طرف ۔۔۔۔

"میں حیران تھا کہ نائب صوبیدار کو پلٹن میں آتے ہی میرے متعلق ساری باتوں کا علم ہوگیا تھا اور اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ میری اور اشرف کی دشمنی ہے۔ اُس نے اشرف سے بھی کہا کہ اگر اُس نے میرے خلاف دشمنی رکھی تو اس کی لانس نائیکی اُتار لی جائے گی۔ اب جبکہ میں حوالدار ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ فوجی کمانڈر کو اپنے جوانوں کے دل کے اندر کی باتوں کا بھی علم ہونا چاہیئے ورنہ وہ اچھی طرح کمانڈ نہیں کر سکتا۔ کمانڈ صرف حکم سے نہیں کی جاتی۔ ہر جوان کا دل اپنی مٹھی میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ نائب صوبیدار کمانڈر کا بہترین نمونہ تھا۔۔۔۔

"لیکن صاحب، میں اشرف کے ساتھ نائب صوبیدار کو بھی دشمن

سمجھنے لگا۔ مجھے بہانہ سازی اور سُست رہنے کی عادت ہوگئی تھی، ساڑھے پانچ سال میں یہ عادت پکّی ہوگئی تھی ۔۔۔۔ رَن کچھ کے جھگڑے کے بعد ہماری پلٹن سرحد کے قریب چلی گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ تو آپ کو معلوم ہے بلکہ مجھ سے زیادہ معلوم ہوگا اس لئے میں یہ ساری باتیں نہیں سناؤں گا۔ میں آپ کو صرف یہ بتاؤں گا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ سرحدوں پر کیا ہو رہا ہے اور رَن کچھ میں کیا ہُوا تھا۔ میں تو باپ کے ڈبل راشن کے لئے اور فرانس، مصر، میرٹھ چھاؤنی اور انبالہ چھاؤنی کی لڑکیوں کے قصّے سُن سُن کر بھرتی ہُوا تھا ۔۔۔۔

"اعوان شریف پر گولا باری کی خبر سُنی تو پلٹن میں ہر ایک جوان غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ شاید صرف میں تھا جس پر کوئی اثر نہیں ہُوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جنگ چھڑ گئی تو کس بہانے سے پیچھے رہوں گا۔ میں نے ایک طریقہ یہ سوچا تھا کہ فیلڈ میں جا کر اپنی ٹانگ میں ہڈی بچا کر اپنی رائفل سے گولی مار کر ہسپتال چلا جاؤں گا ۔۔۔۔ جب اپنے آپ کو گولی مارنے کا خیال آیا تو مجھے اشرف یاد آگیا۔ میرا دل خوش ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب دشمن کی گولا باری اور چھوٹی فائرنگ شروع ہوگی تو میں اشرف کو گولی مار دوں گا۔ فیلڈ میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ گولی کدھر سے آئی تھی ۔۔۔۔

"پھر وہ وقت آیا کہ ہم فیلڈ میں چلے گئے۔ آپ فیلڈ کی بہت کہانیاں لکھ چکے ہیں اس لئے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فیلڈ کا نقشہ کیسا ہوتا ہے، مورچے کس طرح کے ہوتے ہیں اور وہاں اور کیا ہوتا ہے ۔۔۔۔

"ہندوستان لاہور پر حملہ کر چکا تھا۔ میں پہاڑی محاذ پر تھا۔ پہلے ہی روز آگے پہنچے تو آگے سے ایک ایمبولینس آکر میرے مورچے کے قریب رُک گئی۔ گاڑی کے باہر بھی خون کے دھبّے تھے۔ میں کمپنی کا رنر RUNNER تھا۔ مجھے بندے کا پُتّر بنانے والے نائب صوبیدار نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میں نے ایمبولینس میں جھانک کر دیکھا تو میرا دل ڈوب گیا۔ سٹریچر پر

کسی پلٹن کے چار جوانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ خون ہی خون تھا میں نے اُن کے چہرے دیکھے لیکن ہر چہرہ میرا اپنا چہرہ بن گیا۔ دل پر خوف، غم اور معلوم نہیں کیسے کیسے عجیب و غریب خیال چھا گئے۔ میں نے سوچا کہ کل یا پرسوں یا شاید آج ہی میری لاش بھی پیچھے جاتے گی۔ میرے دل کی حالت بہت بُری ہونے لگی۔ اُس وقت مجھے وہ باتیں یاد آنے لگیں جو باپ نے مجھے جنگ کو کھیل تماشہ بنا کر سناتی تھیں مگر اُس کی ہر بات جھوٹی نظر آتی اور میرے دل میں باپ کے خلاف نفرت اور گہری ہو گئی ....

"اچانک ہمارے مورچوں پر دشمن کے گولے پھٹنے لگے۔ ذرا سی دیر میں ہر طرف سیاہ کالا دُھواں چھا گیا۔ گولوں کے دھماکے اور ان کے ٹکڑوں اور پتھروں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ میں نائب صوبیدار کے مورچے میں جا چُھپا۔ وہ مورچے میں نہیں تھا۔ فوراً آ گیا اور کہنے لگا —— 'کمپنی کمانڈر کو رپورٹ کرو۔ وہ تم کو آگے لے جاتے گا'۔ میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا کہ ایسی گولا باری میں وہ مجھے مورچے سے باہر بھیج رہا تھا۔ اُس نے زور سے کہا —— 'کمپنی کمانڈر کو رپورٹ کرو' —— اور اُس نے میرا بازو پکڑا، مورچے سے باہر نکالا اور مجھے کمپنی کمانڈر کے پاس جا کھڑا کیا۔ ہمارے قریب قریب گولے پھٹ رہے تھے اور یہ نائب صوبیدار ذرّہ بھر نہیں ڈر رہا تھا ....

"ایک کھڈ میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ کمپنی کمانڈر اپنے اردلی کو اور مجھے ساتھ لے کر گولا باری میں جیپ تک پہنچا۔ وہاں توپخانے کا ایک کپتان اور دو جوان کھڑے تھے۔ اُن کے پاس وائرلیس سیٹ تھا ہم سب جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ ایک ٹیکری کی اوٹ میں پتھروں پر اُچھلتی پھر ایک خشک نالے میں چلتی کوئی ایک یا ڈیڑھ میل دُور چلی گئی۔ ایک جگہ جیپ رُکی اور ہم سب اُتر کر دونوں افسروں کے پیچھے جُھک جُھک کر چلتے گئے۔ ہمارے اُوپر سے دشمن کے گولے ایسی خوفناک چیخیں مارتے گزر رہے تھے کہ دل پر خوف زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کپتان توپ خانے کا

او پی تھا اور ہماری پلٹن کے ساتھ ایف، او، او جسے فارورڈ آبزرور آفیسر کہتے ہیں۔ وہ آگے جا کر جوابی گولا باری کرانا چاہتا تھا ....

"آگے جا کر ہم ایک ٹیکری پر چڑھ گئے۔ پھر اس سے اُونچی ایک اور ٹیکری پر جا چڑھے اور وہاں سے ہمیں اپنے سامنے دُور دُور تک دشمن کا علاقہ نظر آنے لگا۔ کہیں کہیں درخت بھی تھے اور ہر طرف سبزہ تھا۔ او پی اور ہمارا کمپنی کمانڈر کوئی ایسی جگہ دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ دشمن کو دیکھ کر گولا باری کرا سکیں اور میں کوئی ایسی جگہ دیکھ رہا تھا جو مجھے گولوں اور گولیوں سے پناہ میں لے لے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہم دشمن کے بہت قریب آ گئے ہیں اور کسی بھی وقت رگڑے جائیں گے۔ ہمارے دونوں افسر ایک درخت پر چڑھ گئے اور دُوربینوں سے دیکھنے لگے۔ میں اور دوسرے جوان درخت کے قریب اپنی اپنی آڑ میں ہو گئے ....

"صرف دو منٹ گزرے ہوں گے کہ ہماری توپوں کے گولے دشمن کے گولوں کی طرف چیخیں مارتے ہمارے سروں کے اُوپر سے گزرے اور فوراً بعد مجھے اپنے سامنے دُور دھوئیں اور دُھول کے بادل اُٹھتے نظر آتے۔ فضا میں پھر چیخیں سنائی دیں اور دُور سامنے دھوئیں کے بادل سیاہ گھٹا بن گئے۔ تیسری بار آگے جا کر پھٹی تو دشمن کی زمین سے بہت بڑا شعلہ نکلا جو آسمان کی طرف اُٹھا اور سیاہ گھٹا اُوپر ہی اُوپر اُٹھنے لگی۔ قریب سے کسی جوان نے چلا کر کہا —— 'ایمونیشن' —— دوسرے نے کہا —— 'نہیں پٹرول ڈمپ' —— بہرحال ہمارے گولوں نے دشمن کا ایمونیشن یا پٹرول ڈمپ اُڑا دیا تھا ....

"اُدھر سے آتے ہوئے گولے بھی ہمارے اوپر سے گزر رہے تھے۔ میں ڈر رہا تھا۔ سوائے ڈرنے کے میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے بھی کسی ہندوستانی کی گولی سے مرنا ہے لیکن میں اس ہندوستانی کو دیکھے بغیر مر جاؤں گا۔ وہ کیسا ہوگا؟ سکھ ہوگا یا ہندو؟ ڈوگرہ یا گورکھا؟ اُس کی شکل کیسی ہوگی؟ وہ کس ماں کا بیٹا ہوگا جو مجھے گولی سے مار دے گا؟ اُسے

ماں نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ دیکھو بیٹا کسی کو گولی نہ مارنا، کوئی بے چارہ مجھ جیسی
ماں کا بیٹا مر جائے گا۔ تب یاد آیا کہ میری ماں نے مجھے ایسی نصیحت نہیں کی
تھی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ جوان کیسا ہوگا جو میری گولی سے مرے گا؟ گورا ہوگا
یا سانولا؟ جیسا بھی ہوگا اُس کی ماں میری طرح کی ماں ہوگی۔ اُس کا باپ بھی میرے
باپ کی طرح کا آدمی ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ بھی میری طرح اپنے باپ یا کسی اور
کے باپ کی باتوں کے دھوکے میں بھرتی ہوگیا ہو....

"ایسے ایسے خیال آتے رہے اور دل میں یہ خواہش آئی کہ میں ایک نظر
اُس جوان کو دیکھوں جس کی گولی میرے جسم سے پار ہوگی اور اگر وہ کسی بہانے
مل جاتے تو اُسے کہوں کہ دیکھو گرائیں، تم مجھ پر گولی نہ چلانا، میں تم پر گولی نہیں
چلاؤں گا۔ میری تیری کوئی دشمنی نہیں، یہ شاستری اور ایوب کا جھگڑا ہے....

"میرے قریب سے ایک گولی سیٹی بجاتی گزر گئی۔ میں نے سر نیچے کر
لیا۔ اُس ہندوستانی نے مجھ پر گولی چلا دی تھی جسے میں مرنے سے پہلے یا اُسے
مارنے سے پہلے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی دُور مشین گن فائر
کی آواز سنائی دی۔ میں نے اُس درخت کی طرف دیکھا جس پر توپ خانے کا
او پی اور میرا کمپنی کمانڈر چڑھے ہوتے تھے۔ او پی کپتان گر رہا تھا اور میرا
کمپنی کمانڈر اُسے سنبھال رہا تھا۔ توپ خانے کے دو جوان درخت کی طرف
دوڑے۔ کپتان کی وردی لال ہوچکی تھی۔ بڑی مشکل سے اُسے درخت سے اتارا
گیا۔ کمپنی کمانڈر دوڑ کر اور آگے چلا گیا اور توپ خانے کو فائر آرڈر دینے لگا۔ ہم
پر مشین گن کے کئی برسٹ فائر ہوتے....

"دشمن نے دیکھ لیا تھا کہ ہمارا او پی کہاں ہے۔ اُس نے اسے مارنے
کے لئے مشین گن بھیج دی تھی جس نے ہمارے او پی کو مار لیا تھا۔ او پی کی ڈیوٹی
بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ دشمن سب سے پہلے اسے مارنے کی کوشش کرتا
ہے کیونکہ وہ اپنے توپخانے کی آنکھ ہوتا ہے۔ ہمارا او پی شہید ہوچکا تھا....

"میں سوچ رہا تھا کہ ایک کپتان گر پڑا ہے تو ساری پارٹی واپس چلی
جائے گی۔ دشمن کی مشین گن قریب سے فائر کر رہی تھی لیکن میری مراد پوری

نہ ہوئی۔ او پی کی ڈیوٹی میرے کمپنی کمانڈر اور توپ خانے کے وائرلیس آپریٹر
لانس نائک نے سنبھال لی۔ اُنہوں نے جگہ بدل دی تھی....

"اچانک میری آڑ کے قریب چار دھماکے ہوئے۔ زمین سے شعلے اُٹھے
اور پتھر سے اُڑے۔ دھماکے اور پتھروں کی چیخوں نے میرا جسم سُن کر دیا۔
میرے اُوپر مٹی پڑی۔ میں وہاں سے پیٹ کے بل تیزی سے رینگتا بائیں
طرف چلا گیا۔ سامنے دیکھا تو کوئی تین سو گز دُور مجھے کسی جھاڑی کے پتے ہلتے
نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو مجھے ویسا ہی سٹیل ہیلمٹ (فولادی خود) نظر آیا
جیسا میں نے پہن رکھا تھا۔ یہ پتے اس ہیلمٹ میں اُڑسے ہوتے تھے۔ میں
نے اور غور سے دیکھا تو مجھے ایک چہرے کا دایاں حصّہ نظر آیا اور اس کے سامنے
لائٹ مشین گن بھی نظر آگئی۔ زیادہ غور سے دیکھا تو چہرہ ایک نہیں دو تھے۔
دو ہندوستانی مشین گن کے ساتھ لیٹے ہوتے تھے اور یہی وہ ہندوستانی
تھے جنہوں نے ہمارے او پی کو گرایا تھا....

"اُنہوں نے سر اُوپر اُٹھائے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُنہیں شاید ہمارا
کمپنی کمانڈر نظر نہیں آرہا تھا۔ اُسے ڈھونڈنے کے لئے وہ پوزیشن بدلنے لگے۔
اب دونوں چہرے مجھے اچھی طرح نظر آئے۔ وہ رینگ کر گن کو گھسیٹتے میری
طرف آنے لگے۔ اُن کے چہرے گندمی تھے۔ وردیاں ہرے رنگ کی تھیں۔
وہ کوئی ایک سو گز میری طرف آگئے۔ میں سر چھپائے ہوئے اُنہیں دیکھ رہا
تھا۔ اُنہوں نے مشین گن کو پوزیشن میں کیا اور پہلو بہ پہلو اس کے پیچھے لیٹ گئے۔
ایک نے گن کی میگزین تبدیل کی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ یہ میری طرح کی ماں
کے بیٹے ہیں۔ ہوسکتا ہے سگے بھائی ہوں۔ تب مجھے اچانک خیال آگیا کہ وہ میرے
بھائی نہیں ہیں....

"میں بیان نہیں کرسکتا کہ میرے اندر کیا ہوا۔ بس ایسے محسوس کیا جیسے
میرے اندر ایک پہیہ چل رہا تھا، وہ رُک گیا پھر اُلٹی طرف چلنے لگا اور اتنی
تیز چلا کہ میں چکرا گیا۔ چکر ختم گیا تو معلوم نہیں وہ کون سا شرارہ تھا جس نے میری
رائفل آگے کر دی۔ بایاں ہاتھ آگے اور دایاں بٹ پر چلا گیا۔ ٹرمنگ کے

مطابق میری انگلی نے سیفٹی کیچ آگے کر دیا۔ میں نے اپنی رائفل کی میگزین میں دو چار جر لوڈ کر رکھے تھے۔ ایک راؤنڈ چیمبر میں تھا۔۔۔۔

"میں نے اپنی طرف والے ہندوستانی مشین گنر کے کان کی شست لی۔ اُس کا پورا پہلو میری طرف تھا۔ مجھے اپنی شست پر شک تھا۔ چاندماری میں میری کوئی بھولی بھٹکی گولی بُل میں جایا کرتی تھی۔ ورنہ میری گولیوں کا کچھ سراغ نہیں ملا کرتا تھا کہ کدھر نکل گئی ہیں۔ میں نے بسم اللہ شریف پڑھی۔ ٹریگر کا پہلا دباؤ لیا اور سانس روک کر بڑے پیار سے ٹریگر کو دبا دیا۔ دھماکہ ہُوا۔ رائفل نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں ہندوستانی لیٹے لیٹے ذرا سے اُچھلے اور دونوں کے سر لڑھک گئے۔ میری ایک ہی گولی دونوں کے سروں سے پار ہو گئی تھی۔ اچانک تھوڑا پرے سے دو اور ہندوستانی اُٹھے۔ میں نے جلدی سے ری لوڈ کیا اور گولی چلا دی پھر ری لوڈ کیا اور چوتھے کو اُس وقت نشانہ بنایا جب وہ آڑ لے رہا تھا۔۔۔۔

"جناب عالی! میں آج بھی کہتا ہوں کہ گولیاں میں نے نہیں چلائی تھیں۔ وہ کوئی شہ شرار تھا۔ چاندماری میں میری گولی کبھی نشانے پر نہیں لگی تھی مُوونگ (ہلتے جلتے) ٹارگیٹ پر میری گولی کبھی نہیں لگی تھی۔ میں نے اتنی تیز فائرنگ کبھی نہیں کی تھی۔ میں ریپڈ فائر میں گھامڑ تھا۔ میرے ساتھی پانچ راؤنڈ فائر کر چکے ہوتے تھے تو میرا تیسرا راؤنڈ چیمبر میں جا رہا ہوتا تھا مگر یہاں میں نے دو سیکنڈ میں تین راؤنڈ سے چار ہندوستانی مار لیے تھے۔۔۔۔

"دونوں طرف کے توپ خانے خاموش ہو گئے۔ میں اپنی آڑ میں لیٹا سوچتا رہا کہ کیا یہ چاروں ہندوستانی واقعی مر گئے ہیں یا میری طرح بہانہ بنا کر لیٹ گئے ہیں؟ کمپنی کمانڈر نے آواز دی تو میں اُٹھا اور دوڑ کر اُس تک پہنچا۔ اُس نے پوچھا کہ ادھر سے فائر کس نے کیا تھا؟ میں نے اُسے سارا واقعہ سُنا دیا۔ اُس نے دُوربین سے دیکھا تو بولا — 'شاباش' — ہم چھُپ کر وہاں گئے اور ہتھیار اٹھا لاتے۔ ایک لائٹ مشین گن اور دو سٹین گنیں مع ایمونیشن۔ دونوں گنر جموں کشمیر رائفلز کے ڈوگرے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میری گولی ایک

کی بغل سے داخل ہو کر سینے سے پار ہوتی اور دوسرے کے سینے میں چلی گئی تھی — میں نے نشانہ کان کا لیا تھا۔ ان سے پرے جو مرے ہوتے تھے، ہم اُن کی لاشوں تک نہ گئے۔۔۔۔

"ہم واپس چل پڑے۔ میں نے اپنے اندر جو تبدیلی محسوس کی وہ یہ تھی کہ دل سے خوف نکل گیا تھا اور جسم کے اندر کوئی ایسی طاقت آ گئی تھی جس نے میرا سر اونچا، کندھے سیدھے اور قدم تیز کر دیئے تھے۔ جیپ تک پہنچے تو کپتان کی لاش جیپ میں رکھی جا رہی تھی۔ اسے ڈرائیور اور ٹی اے اٹھا لاتے تھے۔ میں نے لاش کو دیکھا تو میں رو پڑا اور دل میں عہد کیا کہ اتنے خوبصورت کپتان کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لوں گا۔ جیپ پھر وں پر چلی تو میں اپنے مورچوں میں پہنچنے تک کپتان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔"

اس جوان نے اپنی پلٹن کے معرکوں کی تفصیلات سنائیں۔ جنگ کے چھٹے روز اس کی پلٹن ایک اور پہاڑی محاذ پر چلی گئی۔ وہاں دشمن کا توپ خانہ بہت سرگرم تھا لیکن وہ ایسی محفوظ جگہ تھا جہاں ہماری گولا باری اس کا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے دشمن بہت فائدے اُٹھا رہا تھا۔ رات کے وقت اپنی گشتی پارٹیاں جایا کرتی تھیں جن میں کئی ایک جوان زخمی اور شہید ہو جایا کرتے تھے لیکن اس جوان کو کبھی گشتی پارٹی میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ ایک روز فیصلہ کیا گیا کہ کمانڈو اپریشن کے لئے آٹھ جوان بھیجے جائیں جو دشمن کے توپ خانے کو تباہ کر آئیں اور فوراً حملہ کر کے آگے کی زمین پر قبضہ کیا جاتے تاکہ دشمن دوبارہ ایسی جگہ توپ خانہ نہ رکھ سکے۔

یہ مشن ایسا تھا جس کی تکمیل مشکوک تھی اور جوانوں کی موت یقینی۔ علاقہ بے شک پہاڑی تھا۔ چھُپ کر دشمن کے پیچھے پہنچنے کے لئے چھپاؤ اور آڑ بہت ہی اچھی تھیں لیکن دشمن نے اونچی ٹیکریوں پر مشین گن پوسٹیں اور مورچے بنا رکھے تھے۔ نالوں میں اس کے گشتی دستے گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ان اگلے مورچوں کے بہت پیچھے توپ خانہ تھا۔

اس بے حد خطرناک مہم کے لئے اس نائب صوبیدار کو جو ٹریننگ سنٹر

میں اس جوان کا پہلا انسٹرکٹر تھا، حکم ملا کہ آٹھ جوان منتخب کر کے دشمن کا
توپ خانہ خاموش کرنے کے لئے جاتے۔ اُسے نقشے پر وہ جگہ دکھا دی گئی

"نائب صوبیدار نے اچھی طرح جانتے ہوئے کہ میں کیسا سپاہی ہوں
سب سے پہلے مجھے اس مشن کے لئے چُنا" — اس جوان نے سُنایا —
"پھر اُس نے کمپنی کے مانے ہوئے سات تیز، بہترین نشانہ باز اور کھلاڑی
چُننے۔ ان میں اشرف بھی تھا جس کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ جنگ چھڑ گئی تو
اُسے گولی مار دوں گا۔ میں حیران تھا کہ مجھے کیوں چنا گیا ہے۔ ایک ہی وجہ سمجھ
میں آتی تھی کہ یہ اشرف کی کارستانی ہے۔ وہ مجھے مروانا چاہتا ہے۔ وہ اچھی
طرح جانتا ہے کہ میں گھامڑ سپاہی ہوں۔ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ مجھے
کس نے اس قابل سمجھا۔ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ یہ جوان بزدل ہے۔ سچی بات
یہ ہے کہ میں اس مشن میں جانا چاہتا تھا۔ میں اب بزدل اور گھامڑ نہیں تھا۔
مجھے سمجھ آگئی تھی کہ میں کون ہوں اور اب میرا فرض کیا ہے ....

"رات کے دس بجے ہم آٹھ جوان نائب صوبیدار کے ساتھ چل پڑے
ہر جوان کے پاس چار چار گرینیڈ تھے۔ دو لائٹ مشین گنیں، چار رائفلیں،
چار سٹین گنیں اور ایک راکٹ لانچر .... چلنے سے پہلے نائب صوبیدار نے
ضروری حکم دیئے اور بتایا کہ ہمارا اصل کام کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ ہم میں
سے بہت سے جوانوں کا یہ آخری فرض ہوگا۔ یہ فرض ادا کر دو تو خدا تمہیں
اپنی خاص رحمت کے سائے میں بہشت میں رکھے گا ....

"ہم چلے جا رہے تھے تو نائب صوبیدار نے مجھے اپنے ساتھ کر لیا اور
کہنے لگا — 'تم اس پلاٹون کے سب سے زیادہ نکمے سپاہی تھے۔ تم نے اوپی
ڈیوٹی پر جو کام کر دکھایا ہے اس سے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم پاک فوج
کے نمبر ایک جوان ہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اپنے متعلق کچھ شک
ہے۔ میں تمہارا یہ شک دُور کرنے کے لئے تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔
تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ اگر تمہاری رگوں میں تمہاری ماں کے خاوند کا
خون ہے تو آج رات بھی تم وہی کام کر دو گے جو تم نے اوپی کے ساتھ جا کر

کیا تھا۔ آج میں تمہیں آخری سبق دینے کے لئے اپنے ساتھ لایا ہوں'....

"میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے مورچے کے علاقے سے ہم نکل گئے
تو نائب صوبیدار نے سب کو کہا — 'کھانسی، چھینک بند، پاؤں کی آواز
بند، اونچی بات چیت بند، سگریٹ بند، گھسر مسر بند' — ہم نے فلیٹ شوز
پہن رکھے تھے جن سے پتھروں پر چلنا مشکل تھا۔ نائب صوبیدار نے مجھے
کہا — 'پیچھے پاس کرو، سنگل فائل، فاصلہ چھ قدم' — میں نے سرگوشی میں
پیچھے والے کو کہا اور آٹھوں آدمی ایک قطار میں چھ چھ قدم کے فاصلے پر
چلنے لگے ....

"مجھے معلوم تھا کہ ہمیں دشمن کے دائیں پہلو سے دُور پرے سے
اُس کے توپ خانے تک پہنچنا ہے۔ وہ توپ خانہ گولا باری کر رہا تھا۔
ہلکی ہلکی چاندنی تھی جو ہمارے لئے خطرناک تھی۔ توپوں کے علاوہ تمام ہتھیار
فائر ہو رہے تھے جن کی آوازیں پہاڑیوں میں گونج رہی تھیں اور 'ساں ساں'
کی لمبی آوازیں بنی جا رہی تھیں۔ ماحول بہت خوفناک تھا۔ ہم ایک نالے میں ہو
گئے جو خشک تھا۔ دشمن کی طرف والا کنارہ بہت اونچا تھا۔ ہم اپنی طرف کے
کنارے چلے جا رہے تھے۔ نالہ گھوما تو ہم بھی اُس کے ساتھ گھوم گئے۔ آگے
جا کر نالہ دشمن کے علاقے کی طرف گھوم گیا تو ہم دوسری طرف گھوم کر نالے سے
نکل گئے۔ درخت اور جھاڑیاں بہت تھیں اس لئے چھپاؤ اور آڑ کی کمی نہیں تھی۔

"اچانک زمین اور آسمان روشن ہو گئے۔ دشمن نے شک کی بنا پر
اکٹھے دو روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے۔ دونوں راؤنڈ پیرا شوٹوں والے تھے جو
بہت دیر ہوا میں لٹکتے آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ ہم پتھروں کی طرح بے حس
ہو گئے اور جھاڑیوں کی آڑ لے لی۔ شاید کسی مشین گن پوسٹ نے ہمیں دیکھ
لیا تھا۔ یکے بعد دیگرے دو برسٹ فائر ہوئے جو ہمارے اُوپر سے جا کر
ٹیکری پر لگے۔ نائب صوبیدار نے کہا — 'ڈبل' — اور ہم اُس کے
پیچھے دوڑ پڑے اور ایک ٹیکری کی اوٹ میں ہو گئے۔ مشین گن کے دھماکے
دوبار اور سنائی دیئے لیکن ہم دُور چلے گئے تھے ....

"ہم ایک وادی میں چلے جارہے تھے کہ اچانک سامنے سے دو ہندوستانی آگئے۔ ان کی رائفلیں ان کے کندھوں سے لٹک رہی تھیں۔ چاندنی اتنی ہلکی تھی کہ ہری اور خاکی وردی میں کوئی فرق نہیں لگتا تھا۔ نائب صوبیدار کے اشارے پر ہم وہیں دبک کر ایک طرف ہو گئے۔ نائب صوبیدار کھڑا رہا۔ دونوں ہندوستانی آہستہ آہستہ باتیں کرتے آرہے تھے۔ نائب صوبیدار نے سخت غصے میں بڑے زور سے کہا — 'ہل کر چلو جانگلی۔ ادھر لڑائی کرنے آیا ہے یا مائی باپ کا بیاہ کرنے آیا ہے'....

"میں جھاڑی کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں تیز تیز چلنے لگے۔ جب وہ نائب صوبیدار کے پاس سے گزر گئے تو اُس نے کہا — 'ٹھہرو جانگلی! تم کو پاس ورڈ مالم ہے؟ ہم کو مالم ہے تم کو مالم نہیں ہے'— وہ رُک گئے اور ایک نے جواب دیا — 'مالم ہے صاحب.... بلا'....

"میدانِ جنگ میں ہر رات کے لئے ایک 'پاس ورڈ' مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی گھومتا پھرتا آدمی یہ پاس ورڈ نہ بتا سکے تو اُسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ ان ہندوستانیوں نے دھوکے میں نائب صوبیدار کو اپنا کوئی افسر سمجھ کر ہمیں اُس رات کا 'پاس ورڈ' بتا دیا۔ نائب صوبیدار نے کہا — 'ڈبل سے۔ ادھر لڑائی ہے، انبالے کا چھاؤنی نہیں ہے'— اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے....

"نائب صوبیدار نے بتایا کہ ہم شاید راستہ بھول کر دشمن کے مورچوں کے علاقے میں آگئے ہیں۔ ہمیں اور بائیں کو چلنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بائیں کو چلے گئے۔ بہت آگے جا کر نائب صوبیدار نے کہا کہ بیٹھ جاؤ پندرہ منٹ آرام کرو.... ہم اکٹھے بیٹھ گئے۔ نائب صوبیدار نے کہا — 'دیکھو جوان! کوشش کرنا کہ لڑتے ہوئے مر جاؤ۔ قید سے بچو۔ اگر قیدی بننے کا خطرہ ہو تو اپنا ہتھیار پتھر پر مار کر برباد کر دینا۔ دشمن کو اپنے نام نمبر کے سوا کچھ نہ بتانا'....

"اشرف نے کہا — 'صوبیدار صاحب! آرام کا وقت نہیں۔ ہم بیٹھ گئے تو جسم ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ چلتے رہو'— نائب صوبیدار نے اُٹھ کر کہا

— 'چلو۔ تم آرام نہیں کرنا چاہتا تو یہ خوشی کا بات ہے'— اور ہم چلنے لگے تو نائب صوبیدار نے سرگوشی میں سب سے کہا — 'سنو دوستو، اب ہم دشمن کے پیٹ میں آگئے ہیں یا ایسے سمجھ لو کہ ہم موت کے منہ میں پہنچ گئے ہیں۔

اب کسی بھی وقت ہم سب قید ہو سکتے ہیں یا کسی طرف سے ایک گرینیڈ یا ایک مشین گن برسٹ آئے گا اور ہم سب ختم ہو جائیں گے۔ دل سے موت کا ڈر نکال دو۔ اللہ کرے گا ہمارا کام بھی ہو جائے گا اور ہم واپس بھی چلے جائیں گے'....

"تھوڑی دیر بعد ہم ذرا اونچی جگہ چلے جارہے تھے۔ نائب صوبیدار نے وقت دیکھ کر بتایا کہ ایک بج گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اڑھائی بجے چاند غروب ہو جائے گا، پھر اندھیرے میں ہم تیز چلیں گے.... تین چار فرلانگ چل کر ہم ایک نالے میں اُتر گئے۔ ایک طرف اونچی پہاڑی تھی۔ چاند اس کے پیچھے ہو گیا تھا۔ ہم پہاڑی کے سائے میں چلتے گئے۔ یہ کھلا نالہ تھا۔ ذرا دور گئے تو نالے میں ایک ٹرک کی آواز سنائی دی۔ بتیاں گل تھیں۔ ہم سب نالے کے کنارے دبک گئے۔ ٹرک پتھروں پر اُچھلتا ہمارے قریب سے گزر گیا....

"ہم نائب صوبیدار کے پیچھے پیچھے نالے میں آگے کو چل پڑے اور نالہ گھومتا گیا۔ ایک جگہ سے ہم نالے سے اوپر چڑھ گئے اور ایک ٹیکری کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ درختوں کے سائے میں چلنے لگے....

"پھر مجھے یاد نہیں رہا کہ نائب صوبیدار کس طرح دشمن کی مُشک لیتا ہوا ہمارے آگے آگے چلا جارہا تھا۔ کہیں رُک جاتا، ہمیں اشارہ کرتا تو ہم دبک جاتے پھر چل پڑتے۔ ایک جگہ سے دو ٹرک ہمارے قریب سے گزر گئے۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ نائب صوبیدار صحیح راستے پر جارہا تھا اور اگر راستہ صحیح تھا تو اُسے کس طرح علم تھا کہ صحیح راستہ ہمیں دشمن کی گنوں تک لے جائے گا....

"چاند چھپ گیا۔ وادیاں اور ٹیکریاں تاریک ہو گئیں۔ ہم ابھی تک کیڑوں

لکوڑوں کی طرح دشمن کے دوزخ میں چلے جا رہے تھے۔ یہاں میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ جب آپ لوگ شہروں میں بڑی میٹھی نیند سو رہے تھے تو قوم کے آٹھ جوان اور ایک نائب صوبیدار جو بال بچے دار تھا، دشمن کے بہت ہی خطرناک علاقے میں پتھروں پر رینگ رہے تھے۔ ان کے پاؤں فلیٹ شوز میں ننگے پاؤں کی طرح سُوجنے لگے تھے۔ اُنہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ واپس آجائیں گے۔ وہ اتنی دُور نکل گئے تھے جہاں سے کبھی کوئی زندہ واپس نہیں آیا۔ وہ صرف اس لئے جانیں قربان کرنے جا رہے تھے کہ آپ لوگ شہروں میں میٹھی نیند سوئے رہیں، مسجدیں اصطبل نہ بنیں۔ ہماری بہنوں کی عزت محفوظ رہے اور ہمارا جھنڈا اونچا رہے۔ جناب عالی، ہم قوم سے کوئی انعام نہیں مانگتے۔ میں آپ کو یہ بات صرف اس لئے سنانے بیٹھ گیا ہوں کہ آپ لکھ لیں اور قوم کے بچوں کو پڑھائیں تاکہ ہمارے بعد وہ ہماری طرح اپنے آپ میں جانیں قربان کرنے کا جذبہ پیدا کر سکیں اور ان مجاہدوں اور غازیوں کو یاد رکھیں جو میرے ساتھ دشمن کی زمین پر شہید ہو گئے تھے۔ ہم اُن کی قبریں نہیں کھود سکے تھے۔ فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکے تھے۔ اُن کی ہڈیاں دشمن کی مٹی میں مل کر مٹی ہو گئیں۔"

وہ روانی سے بول رہا تھا اور اسی روانی سے اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔

کہنے لگا ــــ "اُن کی قبریں میرے سینے میں ہیں گرائیں جی! میرا سینہ کھول کر دیکھو۔ میں نے ان کے مزار اپنے سینے میں بنائے ہیں۔ وہ جو شہید ہو گئے تھے، میرے لئے پیر اور مُرشد تھے جو مجھ کافر کو ایمان والا اور مجھ بے غیرت کو غیرت مند بنا گئے ــــ اور جب یہ دشمن کے پیٹ میں چلے جا رہے تھے تو وہ سرگوشیوں میں دُسر پُسر کر کے ہنس رہے تھے اور گپ شپ لگاتے جا رہے تھے۔ اُن کے دلوں میں کوئی غم نہ تھا۔ کوئی شک نہ تھا۔ وہ غیّور تھے، دلیر تھے اور صرف ایک لگن سے چلے جا رہے تھے کہ دشمن کا توپ خانہ تباہ کرنا ہے....

"ہم چل چل کر تھک گئے۔ ہم دُور کا چکّر کاٹ کر گئے تھے اس لئے

یہ فاصلہ پندرہ میل کا بھی ہو سکتا ہے اور بیس میل کا بھی۔ اب ہمیں دشمن کا کوئی سنتری یا گشتی دستہ نظر نہیں آتا تھا جس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دشمن کے اگلے مورچوں کے علاقے سے بہت پیچھے آ گئے ہیں۔ نائب صوبیدار نے بات کی تو وہ کچھ فکرمند نظر آیا۔ اُس نے پہلی بار ہمیں بتایا کہ ہمیں صبح طلوع ہونے سے پہلے گنیں برباد کرنی ہیں کیونکہ ہمارے ٹروپس ہمارے وائرلیس کے اشارے پر ڈان اٹیک (سحر کا حملہ) کریں گے....

"اب ہم آگے جانے کی بجائے اِدھر اُدھر سُونگھتے پھر رہے تھے کہ توپخانہ کہاں ہے۔ نائب صوبیدار نے وائرلیس سیٹ آن کیا اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے ملاپ کر کے اپنی جگہ بتائی اور اُدھر سے کوئی حکم لیا۔ وہ خوش ہو کر کہنے لگا ــــ 'ہم تارگیٹ پر آ گئے ہیں'ــــ اُس کے کہنے کے مطابق ہم ایک جنگلاتی ٹیکری پر چڑھنے لگے۔ راستے میں رُک کر اُس نے ہم سب کو جوڑی جوڑی میں بانٹ دیا اور کہا کہ دشمن کا توپخانہ یہیں کہیں ہے۔ پھیل جاؤ۔ تارگیٹ اپنا اپنا، میرے حکم کا انتظار نہ کرنا، مشین گن اور رائفل کا استعمال کم۔ پہلے گرینیڈ۔ تارگیٹ مارو پھر اپنے حکم سے پیچھے نکلنے کی کوشش کرو۔ کوئی جوان شہید ہو جاتے تو اُس کی لاش مت اُٹھاؤ۔ نہیں تو اُٹھانے والا بھی شہید ہو گا۔ زخمی کو اُٹھاؤ۔ دل گُردہ مضبوط رکھو۔ اللہ بیلی جوانو، زندہ رہے تو اس دنیا میں ملیں گے۔ مارے گئے تو اگلے جہان خدا کے دربار میں ملیں گے۔ جاؤ اب میرے حکم کا انتظار نہ کرنا....

"جوان جوڑی جوڑی ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ نائب صوبیدار نے مجھے اور اشرف کو اپنے ساتھ رکھا۔ ہم ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ نائب صوبیدار نے ہم دونوں کو کہا ــــ 'ہاتھ ملاؤ اور پکّے دوست بن جاؤ'ــــ اشرف نے فوراً ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کہا ــــ 'غلطی قصور معاف کر دینا'ــــ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن میں بول نہ سکا۔ گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ اشرف نے کہا ــــ 'میں نائب صوبیدار صاحب کی منّت سماجت کر کے تمہیں اپنے ساتھ لایا

تھا تاکہ تم پکے سپاہی بن جاؤ۔ میں تمہیں ٹریننگ دینا چاہتا تھا اور تمہارے دل میں ایک جذبہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ دل میں کوئی شک نہ رکھنا۔ انسان آگ میں سے نکل کر مسلمان بنتا ہے۔ مجھے بخش دینا۔ اگر میں شہید ہو گیا تو میری ماں کے قدموں میں بیٹھ کر کہنا کہ ماں جی اپنے بیٹے کو دُودھ کی دھاریں بخش دو۔ پھر اُسے بتانا کہ میں کس طرح شہید ہُوا تھا'...

"میرے آنسو نکل آئے اور میں نے اشرف کا ہاتھ چُوم لیا۔ میں نے صرف اتنا کہا — 'اشرف بھائی، دعا کرو۔ ہم اگلے جہان اکٹھے چلیں۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا'...

"اور ہم چل پڑے۔ اندھیرے میں تارگیٹ کا کوئی سراغ نہ ملا اور صبح کا نُور پھیلنے لگا۔ جوں جوں روشنی سفید ہوتی گئی ہمیں سارا علاقہ نظر آنے لگا۔ ہر طرف پہاڑیاں اور اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں۔ ان پر درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ ہم ایک اونچی ٹیکری کی نصف ڈھلان پر رینگ رہے تھے۔ اپنا کوئی جوان نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم نے نیچے دیکھا، ایک نالہ سا تھا۔ ایک ٹرک نظر آیا جو ہمارے نیچے آکر رُک گیا۔ اس میں سے چھ سات ہندوستانی سپاہی اُترے اور ٹرک میں سے ایمونیشن کے بکس اُتارنے لگے۔ دشمن کا توپ خانہ معلوم نہیں کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ پہلے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمارے مورچوں پر گولا باری کرتا تھا۔ گزشتہ رات سے اب تک گنیں خاموش تھیں۔ ہم دُعا کرنے لگے کہ دشمن گولا باری کرے تاکہ گن پوزیشنیں ظاہر ہو جائیں لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف ہم سے بیس پچیس گز نیچے ایک ٹرک سے ایمونیشن کے بکس اتارے جا رہے تھے۔ ہم نہایت اچھے چھپاؤ میں تھے....

"ٹرک کے قریب کھڑے ایک سکھ حوالدار نے ہماری طرف مُنہ کر کے کسی کو آواز دی اور کہا — 'بکسے لے جاؤ تے' — اور ہم سے ذرا سا آگے اور اوپر سے کسی کی آواز سنائی دی — 'چلو' دو جوان۔ ڈبل سے نیچے جاؤ'....

"اللہ تیری شان۔ ایک توپ ہمارے بالکل قریب تھی۔ ہم دبک گئے۔ ذرا سی دیر میں دو ہندوستانی سپاہی اُوپر سے اُترے اور سیدھے نیچے چلے گئے۔ وہ ضرور

توپ کے مورچے سے نکلے تھے۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ ان دو ہندوستانیوں نے نیچے جا کر ایک ایک بکس کندھے پر اُٹھا لیا اور اوپر چڑھنے لگے۔ نائب صوبیدار نے سرگوشی میں مجھے کہا — 'گرینیڈ نکالو، پھینکنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب یہ جوان بکس اوپر لے آئیں گے تو میرے اشارے پر تم گرینیڈ ٹرک پر پھینک دینا۔ باقی ہم سنبھال لیں گے ....

"میں نے گرینیڈ تیار کر لیا۔ اشرف کے پاس راکٹ لانچر اور گولے تھے۔ سٹین گن بھی تھی اور گرینیڈ بھی۔ دونوں ہندوستانی سپاہی بکس اُٹھاتے ہوتے اُوپر آرہے تھے۔ ہم دم سادھے چُھپے بیٹھے تھے۔ اوپر سے کوئی دیکھتا تو ہم نظر بھی آسکتے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ہم تینوں کی نظریں دو ہندوستانیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میری مُٹھی میں گرینیڈ تھا۔ میں نے گرینیڈ کو ہاتھ میں تول کر ٹرک کے فاصلے کو دیکھا ...

"مشکل یہ پیدا ہونے لگی کہ ہندوستانی سپاہی اوپر چڑھتے وقت بالکل ہماری طرف آرہے تھے۔ چڑھنے کے لئے یہ راستہ آسان تھا۔ ہم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ وہ اوپر ہی اوپر آرہے تھے حتیٰ کہ اُن کے چہروں پر پسینے کا ایک ایک قطرہ صاف نظر آنے لگا۔ نائب صوبیدار نے مجھے سرگوشی کی — 'کافر سیدھے آرہے ہیں۔ گرینیڈ ٹرک پر پھینک دو' — میں نے بسم اللہ شریف پڑھی اور اشرف نے کہا — 'یا اللہ مدد' — میں نے نیلنگ (گھٹنوں کے بل) ہو کر گرینیڈ پھینک دیا۔ گرینیڈ اُن دو ہندوستانی سپاہیوں کے سروں کے اوپر سے گزر گیا جو بکس اٹھاتے ہوتے ہماری طرف آرہے تھے۔ یہ بسم اللہ شریف کی برکت تھی کہ گرینیڈ ٹرک پر پڑا۔ ٹرک پر ترپال نہیں تھا۔ ابھی بہت سے بکس ٹرک میں تھے ....

"جناب عالی! میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ جو دھماکہ ہُوا وہ کیا تھا اور جو شعلہ اُٹھا وہ کیسا تھا۔ میں نے جونہی گرینیڈ ہاتھ سے چھوڑا تھا، نائب صوبیدار نے کہا تھا — 'لیٹ جاؤ۔ ہاتھ کانوں پر رکھو' — اگر ہم لیٹ نہ جاتے تو اُڑ جاتے۔ توپوں کا سارا ایمونیشن اکٹھا پھٹا تھا۔ ایسے لگا جیسے آگ کا ایک پہاڑ

ہمارے قریب سے گزر گیا ہو۔ اگر ہم کان ہاتھوں سے بند نہ کر لیتے تو کانوں
کے پردے پھٹ جاتے ....

"دھماکے کی تپش اور ٹکڑے اور پتھر اُڑ کر دُور نکل گئے جس میں شاید
ایک سیکنڈ لگا ہوگا۔ نائب صوبیدار اُٹھ دوڑا اور کہا — 'چارج' — میں
نے دیکھا کہ بکس اوپر لانے والے دونوں ہندوستانی غائب تھے۔ نائب
صوبیدار آگے اور اوپر کو دوڑا۔ ہم دونوں اُس کے پیچھے تھے۔ نیچے ابھی
پیچھے گولے آگ میں پھٹ رہے تھے اور دھماکوں سے پہاڑ ہل رہے
تھے۔ ہم اُوپر گئے تو نہایت اچھی طرح چھپی ہوئی پوزیشن میں ایک فیلڈ گن نظر
آئی۔ نائب صوبیدار نے کہا — 'اشرف، گرنیڈ' — ہندوستانی توپچی ٹرک
کے دھماکے سے ڈرے ہوئے توپ کے ادھر اُدھر چھپے ہوئے تھے۔ اشرف
نے گرنیڈ پھینکے اور ہندوستان کی ایک گن صاف ہو گئی۔ کوئی توپچی زندہ نہ رہا ....

"بالکل اُسی وقت بائیں طرف والی ٹیکری پر ایسا ہی دھماکہ ہوا اور
ہمارے کسی جوان کا نعرہ سنائی دیا — 'یا علیؑ' — اس کے ساتھ ہی
مشین گنیں فائر ہونے لگیں۔ ہم تینوں اس گن کو تباہ کر کے دوڑ دوڑ کر دوسری
گنوں کو دیکھنے لگے۔ پندرہ بیس گز دُور ایسی ہی چھپی ہوئی ایک اور گن
دکھائی دی جس کی صرف نالی نظر آ رہی تھی۔ نائب صوبیدار نے مجھے گرنیڈ
پھینکنے کو کہا۔ میں نے گرنیڈ پھینکا اور اس گن کا بھی صفایا ہو گیا ....

"اس کے بعد وادی میں دھماکوں اور مشین گنوں کے شور کے سوا
اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی "یا علیؑ" کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ میرے
ساتھیوں نے گنیں ڈھونڈ لی تھیں۔ میں دشمن کو شاباش دیتا ہوں کہ اُس
نے فوجی لحاظ سے فائدہ مند اور محفوظ بلندی پر توپ خانہ رکھا تھا۔ اس
توپ خانے نے ہمارا بہت نقصان کیا تھا ....

"نائب صوبیدار نے وائرلیس پر بریگیڈ سے ملاپ کیا اور اپنا خفیہ
لفظ کہہ کر رپورٹ دی اور کہا — 'مُود' — اور ہم وہاں سے چھپ کر
دوڑنے لگے۔ ہم ٹیکری کی ڈھلان پر تھے۔ کوئی دس گز دُور سے پانچ چھ

ہندوستانی سپاہی بھاگتے ہوئے نیچے اُتر رہے تھے۔ اشرف نے
سٹین گن ہپ سے لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ سارے ہندوستانی گر پڑے۔
ہم دوڑ پڑے۔ ایک کافر کی ٹانگ بُری طرح زخمی ہوئی تھی۔ وہ بڑی بے شرمی
سے دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہم اُس کے پاس جا کھڑے ہوئے تو وہ
اور زیادہ دہائی دہائی کرنے لگا۔ نائب صوبیدار نے پوچھا — 'اور گن پوزیشن
کدھر ہے؟ زندہ رہنا چاہتے ہو تو فوراً بولو' — اُس نے ہاتھ جوڑ کر اور رو
رو کر دو اور گن پوزیشنیں بتا دیں جو زیادہ دُور نہیں تھیں۔ ان میں سے
ایک کو ہم نے گرنیڈ سے ختم کیا اور دوسری ذرا دُور تھی۔ ہم اُدھر جا ہی
رہے تھے جہاں وہ گن تھی کہ وہاں دُھواں اُٹھا اور گرنیڈ کا دھماکہ ہوا۔
ہمارا کوئی اور ساتھی وہاں پہنچ گیا تھا ....

"آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ کام تو بہت آسان تھا۔ گرنیڈ
پھینکتے گئے اور گنیں اُڑاتے گئے۔ ایسا بالکل نہ سوچنا گرائیں جی! ہماری
کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی کہ ٹرک والے ایمونیشن کے دھماکے نے ہندوستانیوں
کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ بہت خوفناک دھماکہ تھا۔ پھر ان کی ایک دو گن پوزیشنوں
میں گرنیڈ پھٹے تو ساتھ توپوں کا ایمونیشن بھی پھٹا۔ یہ دھماکے بڑے ظالم تھے۔
پہاڑیوں میں رائفل کا دھماکہ توپ کے گولے کی طرح سنائی دیتا ہے۔ پھر اس
کی گونج وادیوں میں کئی دھماکے سناتی ہے۔ وہاں اب دھماکے تھے اور سیاہ
دھوآں اُٹھ اُٹھ کر پھیلتا جا رہا تھا۔ ایسے حال میں دنیا کی کوئی بہادر فوج بھی
ہوش ٹھکانے نہیں رکھ سکتی ....

"پھر ہمیں ہندوستانی افسروں وغیرہ کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ اپنے
سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ یہ لفظ سنائی دیتے — 'مت گھبراؤ۔
کانڈ وہیں۔ تھوڑے ہیں۔ روک لو۔ جانے نہ دو' ....

"اور اچانک اس علاقے میں گولے پھٹنے لگے۔ یہ ہمارے توپخانے
کی گولا باری تھی۔ نائب صوبیدار نے وائرلیس پر انہیں 'مُود' کا اشارہ دے
دیا تھا لیکن اپنی توپوں کے گولے وہیں پھٹ رہے تھے جہاں ہم سب تھے۔

اشرف نے نائب صوبیدار سے کہا — "انہیں میسج دو کہ ایمونیشن مت ضائع کرو۔ شیلنگ کی ضرورت نہیں۔ ایڈوانس کرو"— نائب صوبیدار نے ذرا سوچ کر وائرلیس پر اپنے خفیہ الفاظ بولے اور اپنے توپ خانے کا رینج گرا دیا جسے ہم فوجی زبان میں ڈراپ کہتے ہیں۔ فوراً بعد ہمارے توپخانے کے گولے ہم سے دُور اُس جگہ پڑنے لگے جہاں دشمن کے اگلے مورچے تھے....

"اب ہم میں اور ہمارے اگلے ٹروپس میں صرف ڈیڑھ میل کا فاصلہ تھا۔ یہاں تک ہم بیس میل کا چکر کاٹ کر پہنچے تھے۔ اب ہمیں واپس جانا تھا اور یہ بہت مشکل کام تھا۔ ہم آئے رات کو تھے۔ اب سورج نکل آیا تھا۔ آگے بے تحاشہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم ٹیکری سے چُھپ چُھپ کر اُترے تو ایک طرف سے کسی مشین یا سٹین گن کا برسٹ آیا جو ہمارے قریب پڑا۔ ہم بچ گئے اور چُھپ چُھپ کر ایک نالے میں اُتر گئے۔ ایک کنارا دیوار کی طرح بہت اونچا تھا۔ ہم اُس کی آڑ میں دوڑ پڑے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ نائب صوبیدار ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے اور ہمیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ ہمارے باقی ساتھی کہاں ہیں....

"ہم بھاگے چلے جا رہے تھے۔ نالے کے دونوں طرف پہاڑ اونچے ہی اونچے ہوتے جا رہے تھے۔ نالہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھوم جاتا تھا۔ بہت آگے چلے گئے تو ایک طرف سے بڑی خوفناک گڑگڑ سنائی دی۔ نائب صوبیدار نے اشرف سے راکٹ لانچر لے لیا اور ہمیں پیچھے رُکنے کا کہہ کر آگے چلا گیا۔ آگے نالہ بہت تنگ تھا اور اس کی دو شاخیں ہو جاتی تھیں۔ ہم آگے چلے گئے۔ دیکھا کہ ایک طرف سے آگے پیچھے چھ ٹینک آ رہے تھے۔ نالہ اتنا تنگ تھا کہ ایک ٹینک گزر سکتا تھا۔ ہم پیچھے ہو گئے لیکن نائب صوبیدار کو پیچھے ہٹنے کی مہلت نہ ملی۔ اگلے ٹینک نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مشین گن فائر کی۔ نائب صوبیدار گر پڑا۔ ہم آڑ میں تھے۔ اگلا ٹینک بارہ چودہ گز تک آ گیا۔ نائب صوبیدار جسم میں پورا برسٹ لے کر اُس کی ساری وردی لال ہو گئی تھی۔ راکٹ لانچر اُس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ اُس نے لانچر اٹھایا۔ راکٹ لوڈ تھا۔ اُس نے جلدی سے لانچر کندھے پر رکھا۔ ٹینک پندرہ گز تک آ گیا تھا۔ نائب صوبیدار نے راکٹ فائر کر دیا۔ اشرف اُس کی طرف دوڑا۔ اُس نے مجھے کہا تھا — "تم اِدھر ٹھہرو۔ میں لانچر لے لوں گا"....

"آپ سویلین ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ پہاڑی علاقے میں ٹینک نہیں لے جاتے۔ ٹینکوں کی لڑائی میدانی علاقے میں ہُوا کرتی ہے لیکن انڈیا کے پاس اسلحہ ایمونیشن اتنا زیادہ تھا جسے وہ سنبھال نہیں سکتا تھا۔ وہ ٹینکوں کو شاید توپ خانے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے پہاڑی علاقے میں لے آیا تھا۔ ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے۔ انڈیا کشمیر کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لئے وہ پہاڑی علاقے میں بھی ٹینک لے آیا تھا ...

"نائب صوبیدار کا راکٹ ٹینک میں لگا اور اندر جا کر پھٹا۔ ٹینک فوراً نہیں رُکا۔ انجن کے زور پر چلتا آیا۔ نائب صوبیدار گر پڑا تھا۔ اشرف اس کے قریب پہنچ گیا اور ٹینک نائب صوبیدار کے اُوپر آ کر اسی طرح پھٹا جس طرح ایمونیشن والا ٹرک میرے گرینیڈ سے پھٹا تھا۔ اشرف پیچھے جا پڑا اور ٹینک سے پہاڑیوں جتنے اونچے شعلے نکلنے لگے۔ نائب صوبیدار جلتے ٹینک کے نیچے پڑا تھا۔ پیچھے والے ٹینک آگے نہیں آ سکتے تھے کیونکہ جلتے ہوئے ٹینک نے راستہ روک لیا تھا....

"اشرف مجھ تک پہنچ گیا۔ میں آڑ میں تھا۔ جب ٹینک پھٹا تو اُس کا کوئی ٹکڑا اُسے ایسا لگا تھا کہ پیٹ پھٹ گیا اور بایاں بازو جسم کے ساتھ لٹکنے لگا۔ میں اُسے اُٹھا کر پیچھے لے آیا لیکن اشرف نے روک لیا۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک جھاڑی میں اُتارا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا — "جاؤ دوست، میری ماں کے قدموں میں"... اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔ میں پاگلوں کی طرح اُس کے گالوں کو ہاتھ میں تھام کر ہلانے اور چلّانے لگا — "اشرف، میں تمہیں واپس لے جاؤں گا۔ خدا کے لئے میرے

ہاتھوں میں جان نہ دینا۔ تم میرے بھائی ہو۔۔۔۔ اشرف! میرے دوست میرے گرائیں، آنکھیں کھولو۔ زندہ رہو'۔۔۔ اور میں نے دھاڑیں مار کر کہا ——'میرے عزیز دوست، میں تمہیں اپنی بہن کا رشتہ دوں گا'—— مگر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا تھا۔۔۔۔

"اُدھر نائب صوبیدار ٹینکوں کا راستہ روک کر شہید ہو گیا۔ اِدھر اشرف شہید ہو گیا۔ یقین کرنا گرائیں جی، مجھے وادی میں نائب صوبیدار کی اُس وقت کی آواز سنائی دی جب وہ ٹریننگ سنٹر میں حوالدار تھا۔ اُس نے ہمارے سکواڈ کو کہا تھا —— 'تم لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ کی زمین کا والی وارث ہے۔ ہم تم کو اس واسطے گالی بکا کہ تم ٹھیک سے مسجد اور قرآن مجید کا رکھوالا بن جاؤ'—— اور تھوڑی دیر پہلے اُس نے مجھے کہا تھا —— 'میں تمہیں آخری سبق دینے کے لئے ساتھ لایا ہوں'—— آہ، مجھے وہ آخری سبق دے گیا تھا۔ پہاڑوں میں مجھے اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اُس کے سارے بھولے بسرے سبق یاد آ گئے تھے مگر اُس نے آخری سبق اپنی جان دے کر دیا۔ میں اُس کے آخری سبق کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ وہ اصل مسلمان تھا جو مجھے اصل مسلمان بنا گیا"۔

مجھے کہانی سنانے والے جوان کے آنسو بہہ نکلے۔ بہت دیر سر جھکا کر چُپ رہا۔ پھر اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا —— "اب میں آپ کو یہ نہیں سناؤں گا کہ میں اپنے مورچوں تک کس طرح پہنچا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں آپ کو صرف اُن بہادروں کی کہانی سنانا چاہتا تھا جو آج تک واپس نہیں آتے۔ ہمارے ٹروپس نے اُس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ دشمن کے جس توپخانے کو ہم نے کمانڈو اپریشن سے تباہ کیا تھا اُس کی گنیں ایسی بلندی پر اور اتنی اچھی پوزیشن میں تھیں کہ ہمارے ٹروپس کو ایک انچ آگے نہیں بڑھنے دیتی تھیں۔ اِدھر ہم نے یہ گنیں تباہ کیں، اُدھر سے ہماری دو بٹالین نے حملہ کر دیا۔ توپوں کی جگہ پوری کرنے کے لئے دشمن نے چھ ٹینک بھیجے لیکن نائب صوبیدار نے ایک ٹینک کے ساتھ خود بھی جل کر ٹینکوں کا راستہ روک لیا۔۔۔۔

"ہم صرف تین جوان اپنی یونٹ میں واپس آتے۔ تین روز بعد دو کی لاشیں مل گئی تھیں۔ اشرف کی لاش نہیں ملی تھی۔ میں اُس جگہ گیا تھا۔ وہاں جما ہُوا خون تھا۔ لاش نہیں تھی۔ اس مشن کے بعد میں بالکل بدل گیا۔ مجھے اپنا باپ اچھا لگنے لگا۔ میں اُسی کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہُوا تھا۔ اگر نہ ہوتا تو مجھے یہ سعادت کبھی نصیب نہ ہوتی۔ میں کبھی انسان نہ بنتا بلکہ میں کبھی مسلمان نہ بنتا۔ مورچوں میں ہی مجھے والد صاحب کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا —— 'عزیز بیٹے! مجھے معلوم ہے کہ تم فوج میں کیوں بھرتی ہوتے تھے اور اب تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے کیوں اتنے فخر سے تمہیں بھرتی کرایا تھا۔ میں غلام تھا، تم آزاد ہو۔ غلام بھاگا کرتے ہیں اور آزاد جوان قوم کی عزت کی خاطر جانیں قربان کیا کرتے ہیں۔ تم یاد رکھو کہ تمہاری صرف ایک بہن نہیں ہے۔ سارا ملک تمہاری بہنوں سے بھرا پڑا ہے۔ محاذ پر بے غیرت نہ بن جانا۔ اشرف کی شہادت کا تار آ گیا ہے۔ میں بھی ایسے ہی تار کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ مجھے اور ماں کو خدا کے حضور شرمسار نہ کرنا'—— میں اب اپنے والد صاحب کو فرشتہ سمجھتا ہوں۔۔۔۔

"بھائی صاحب! اب میری یہ حالت ہے کہ لوگ چھٹی جاتے خوش ہوتے ہیں لیکن میں گاؤں جانے سے گھبراتا ہوں کیونکہ اشرف کی ماں کے پاس ضرور جانا ہوتا ہے۔ وہ صرف اشرف کی باتیں سنانے کو کہتی ہے اور ہر بار یہ ضرور پوچھتی ہے —— 'اشرف نے زخمی ہو کر پانی مانگا ہو گا؟ تم نے اُسے پانی پلایا تھا؟ اُس نے مجھے یاد کیا تھا؟ کیا کہتا تھا؟ اُس نے ہائے تے کی ہو گی؟ اُسے درد ہُوا ہو گا؟ تم نے اُسے دفن کر دیا تھا؟'—— اور جناب وہ ایسی ایسی باتیں پوچھتی ہے کہ میں اپنے اُوپر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پھر جب اپنی بہن کو دیکھتا ہوں تو اپنے اوپر لعنت بھیجنے لگتا ہوں۔ تین سال ہوتے اُسے بیاہ دیا ہے۔ وہ گھر میں بڑی سُکھی ہے لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اشرف کی بیوہ ہے۔ وہ شہید کی بیوہ ہے۔ میں گناہگار ہوں —— اور بس ایسے ایسے خیال آتے ہیں اور بہت پریشان کرتے ہیں۔۔۔۔

"یہ تو سب کچھ مجھ پر گزری ہے اور جو اشرف کی ماں پر گزر رہی ہے

وہ اُس کا خدا جانتا ہے یا میں جانتا ہوں مگر آپ سے ایک سوال پوچھوں گا،
کیا پاکستان والے جانتے ہیں کہ ماؤں کے نہ جانے کتنے گھبرو اور لاڈلے بیٹے
دشمن کی خاک میں خاک ہو گئے مگر اپنے ملک کی خاک کو دشمن کے قدموں سے
ناپاک نہ ہونے دیا؟ کیا ہمارے بعد پیدا ہونے والے بچوں کو کوئی بتاتے گا کہ
بچو، تمہارے باپ دادا بڑے غیور تھے، بڑے ہی بہادر تھے؟ — وہ دشمن
کی آگ میں کود جایا کرتے تھے اور اُن کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں تصوروں
میں اُن سے پیار کیا کرتی تھیں؟"

وہ میرے جواب کے انتظار میں میری طرف دیکھتا رہا، حتیٰ کہ اُس کے
آنسو بہہ نکلے جو میرے آنسوؤں کے دھندلکے میں روپوش ہو گئے۔

کیان، کرنل کیانی اور قرآن کی کہانی

یہ کہانی اُس مردِ مومن کی ہے جس نے لیپا وادی کا معجزہ نما معرکہ
لڑا یا اور آزاد کشمیر کی قربان گاہ پر جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔
کرنل حق نواز کیانی شہید قرآن سے راہنمائی لیتے تھے۔ انہیں جو
بشارتیں ملیں اور جس طرح انہوں نے قرآن کا کرشمہ دکھایا وہ ان
کے آخری خطوط اور ان کے ایک کمپنی کمانڈر میجر جمشید گلزار
کے خط کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ معرکہ جو لیپا وادی کے ایک ساڑھے نو ہزار فٹ بلند پہاڑ کی چوٹی پر
لڑا گیا تھا، عام قسم کی لڑائی نہیں تھی جس کی ٹریننگ فوج کی درسی کتابوں یا
مروّجہ عملی طریقوں سے دی جاتی ہے۔ یہ معرکہ جنگی ٹریننگ اور قوت سے نہیں بلکہ
ایمان کی قوّت سے لڑا گیا تھا۔

لیپا وادی کو وادیٔ کیان بھی کہتے ہیں۔ اسے یہ نام کیان نام کے ایک
گاؤں کی بدولت دیا گیا ہے جو اس وادی کے ایک گوشے میں واقع ہے۔ کیان
اور اس کا ماحول رُوح پرور اور بے حد دلکش ہے۔ جنگ میں وادی کو لیپا کہا
جانے لگا اس لیے باہر کی دنیا اسے لیپا ہی کہنے لگی۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس
کا نام کیان بھی ہے اور اب تو کیان ہی واحد نام ہے جو اس وادی کے لیے

موزوں ہے کیونکہ اس وادی میں معجزہ نما معرکہ لڑنے والا اور خدا کی اس حسین
وادی کی قربان گاہ پر جان کا نذرانہ دینے والا جو مجاہد تھا، اس کا نام کرنل کیانی
شہید تھا۔ یہ معجزہ اسی مردِ مومن کی قوّتِ ایمانی کی بدولت رونما ہوا تھا۔

لیپا وادی (وادیٔ کیان) آزاد کشمیر کی وادیٔ کرناہ کا ایک تہائی حصّہ ہے۔
اس کی لمبائی چودہ میل اور چوڑائی نصف میل ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی
پانچ ہزار فٹ ہے اور پہاڑوں کی بلندی آٹھ ہزار فٹ سے چودہ ہزار فٹ سے
بھی زیادہ ہے۔ جغرافیائی طور پر شمال کی طرف چودہ ہزار فٹ شمسا بری رینج نام
کے پہاڑ جو تمام سال برف تلے دبے رہتے ہیں، واقع ہیں اور مشرق کی طرف
ساڑھے بارہ ہزار فٹ بلند قاضی ناگ پہاڑ ہے۔ مغرب کی طرف دس ہزار
فٹ بلند پنجال گلی اور برتھوار گلی اور کافر کھنڈ ایستادہ ہیں۔ ان بلند و بالا
پہاڑوں نے وادیٔ کیان کو قلعے کی دیواروں کی طرح گھیرے میں لے رکھا ہے۔
یہاں جو لوگ آباد ہیں ان میں اکثریت کیانی نسل کے مسلمانوں کی ہے لیکن کرنل
کیانی شہید وادیٔ کیان کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ تحصیل جہلم کے
گاؤں جادہ کے رہنے والے تھے۔

آمد و رفت سال میں آٹھ مہینے پنجال گلی اور برتھوار گلی کی چوٹیوں
اور دروں سے ہوتی ہے۔ باقی عرصہ تمام تر کوہستان برف تلے دب جاتا
ہے اور ذرائع آمد و رفت مسدود ہو جاتے ہیں۔ زندگی ہی منجمد ہو جاتی ہے۔
ہر شے دفن ہو جاتی ہے۔ وہاں کوئی جاندار سرگرم اور متحرک ہوتا ہے، وہ خاکی
وردی میں ملبوس ہمارا فوجی بھائی ہے۔ ہمارے جیالے اس منجمد دنیا میں نہ
صرف زندہ رہتے ہیں بلکہ اپنی ڈیوٹی پر بالکل اسی طرح چاک و چوبند رہتے
ہیں جس طرح سیالکوٹ اور لاہور کے میدانی مورچوں میں یا راجستھان کے
ریگزاروں میں۔ برف میں ڈوبی ہوئی وادیوں اور ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر وہ
زیادہ ہی چوکس رہتے ہیں کیونکہ ہمارے دشمن کی توجہ ہر لمحہ کشمیر کی ان آزاد
وادیوں اور بلندیوں پر مرکوز رہتی ہے۔ بھارت شروع سے ہی وادیٔ کیان پر
قبضہ کرنے کے منصوبے بناتا رہا ہے کیونکہ یہ وادی جنگی اہمیت کی حامل ہے،

اور علاقی لکڑی کی افراط کی بدولت اسے تجارتی اہمیت بھی حاصل ہے۔

جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارت نے بہت زیادہ جنگی قوت سے اس
وادی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر آزاد کشمیر کی مختصر سی فوج نے اسے کامیاب
نہ ہونے دیا بلکہ دشمن کے ایک ایسے علاقے پر قبضہ کر لیا جس سے اس کا وہ بریگیڈ
جو لیپا وادی میں لڑ رہا تھا وہ اپنے ڈویژن سے کٹ گیا۔ اس علاقے کا نام
جوہا بلج ہے۔ یہ آزاد کشمیر فوج کے قبضے میں آجانے سے دشمن کے لیپا والے
بریگیڈ کی کمک اور سپلائی کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اب اس بریگیڈ کو سپلائی
پہنچانے کے لیے دشمن کو چار پانچ روز کی ایسی مسافت طے کرنا پڑتی تھی جس
کے راستے میں ہزاروں فٹ بلند اور برف پوش پہاڑ حائل تھے۔ بلکہ اسے شمسابری
رینج کے اوپر سے سپلائی کا راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اس کے ٹیلیفون تار بھی اسی
راستے سے گزرتے تھے، وہ بھی کٹ گئے۔

جب فائر بندی ہوئی تو جوہا بلج آزاد کشمیر فوج کے پاس تھا لیکن لیپا وادی
میں ہماری ایک پوسٹ، بیرو والی ناڑ، دشمن کے گھیرے میں رہ گئی۔ اسے سپلائی
پہنچانے کا راستہ ایسے دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا تھا جو دشمن کے قبضے
میں تھے۔ بہرحال اس راستے سے جو دراصل ایک ندی ہے، بیرو والی ناڑ کو راشن
وغیرہ جاتا رہا۔ دشمن کے پاس اپنے بریگیڈ کو سپلائی پہنچانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔
اپریل ۱۹۷۲ء کے آغاز میں بھارتیوں نے ہمارے کمانڈروں سے جوہا بلج سے
سپلائی اور ٹیلی فون تار گزارنے کا راستہ مانگا۔ ہمارے کمانڈروں نے صاف انکار
کر دیا۔ دشمن کا یہ مطالبہ بالکل ایسا تھا جیسے وہ ہمیں کہے کہ اس کا ایک بریگیڈ
سیالکوٹ سیکٹر میں محصور ہو گیا ہے، اسے راشن اور ایمونیشن پہنچانے کے لیے
لاہور شہر میں سے گزرنے کی اجازت دی جائے۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء کے روز دشمن نے بزورِ بازو راستہ لینے کی کوشش
کی اور جوہا بلج کی دو اہم پوسٹوں گُرسی ڈنہ اور گٹی پتھر پر پہلے تو شدید گولہ باری
کی پھر مکمل جنگی اہتمام سے حملہ کر دیا۔ ان پوسٹوں میں آزاد کشمیر کی صرف ایک ایک
پلاٹون مورچہ بند تھی۔ انہوں نے کئی گنا طاقت ور دشمن کا حملہ بُری طرح پسپا کر دیا۔

دشمن جانی نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کوشش ناکام ہوئی تو اس نے
وادیٔ کیان (لیپا وادی) میں ہماری اُس پوسٹ کی سپلائی کا راستہ بند کر دیا جو
فائر بندی کے وقت گھیرے میں رہ گئی تھی۔ حالانکہ فائر بندی کے وقت سے یہ راستہ
آزاد کشمیر فوج کی تحویل میں تھا۔ یہ پوسٹ بیرو والی ناڑ، دراصل ہماری ایک کمزور رگ
تھی کیونکہ اس کے تین اطراف کی بلندیوں پر دشمن مورچہ بند تھا۔ اور اب اس نے
سپلائی کا راستہ بھی بند کر دیا۔

مقامی کمانڈروں نے کانفرنس کا فیصلہ کیا۔ اُدھر سے نمبر ۹ سکھ رجمنٹ کا
کمانڈنگ آفیسر کرنل چنگیا پا آیا۔ ادھر سے کرنل حق نواز کیانی شہید گئے۔ اس کانفرنس
میں کرنل چنگیا پا نے وہی مطالبہ پیش کیا کہ انہیں جموہا بلج میں سے راستہ دیا جائے۔
اب کے اس کے لہجے میں درخواست کا نہیں دھمکی کا رنگ تھا۔ کرنل حق نواز کیانی
شہید نے چیلنج قبول کرنے کے انداز سے مطالبہ ٹھکرا دیا۔ یہ کانفرنس ۲۹ اپریل ۷۲ء
کے روز ہوئی تھی۔ انہی افسروں کی دوسری ملاقات ۳ مئی ۱۹۷۲ء کے روز ہوئی جس
میں کرنل چنگیا پا نے کرنل کیانی شہید سے کہا —— "میرے بریگیڈ کمانڈر نے کہا
ہے کہ آزاد کشمیر فورس بیرو والی ناڑ والی پوسٹ خالی کر دے یا جموہا بلج سے گٹی بھر
والی پوسٹ خالی کر دے ورنہ ہم بیرو والی ناڑ کا راستہ نہیں کھولیں گے۔"

کرنل حق نواز کیانی شہید نے کہا —— "ہم راستہ خود کھول لیں گے" ——
اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کرنل چنگیا پا نے کہا —— "پہلی گولی ہماری طرف سے
فائر نہیں ہوگی" —— کرنل کیانی شہید نے سنی اَن سنی کر دی اور واپس آگئے۔ ان
کے ساتھ میجر اشتیاق احمد اور میجر یار افضل آفریدی تھے۔ کرنل کیانی شہید اپنے
افسروں اور جوانوں کو بیٹا کہا کرتے تھے۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے میجر
اشتیاق احمد اور میجر آفریدی سے جب یہ کہا —— "دیکھو بیٹو! ہم راستہ
خود کھول لیں گے" —— تو دونوں افسروں کو اپنے کمانڈنگ آفیسر کا لب و لہجہ بدلا
ہوا سا لگا مگر وہ سمجھ نہ سکے کہ آنے والا کل اُن کے جری اور غیور کمانڈنگ آفیسر
کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اسی رات (۴/۳ مئی ۱۹۷۲ء) گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بھارتیوں نے

ہماری اگلی تمام پوسٹوں پر توپ خانے کی گولا باری شروع کر دی۔ صبح چار بجے دشمن
کی نمبر ۴ مہار رجمنٹ نے آزاد کشمیر کی بیرو والی ناڑ پوسٹ جو دشمن کے گھیرے
میں تھی، پر دو طرفی حملہ کر دیا۔ دشمن نے کئی دنوں سے اس پوسٹ کی سپلائی کا راستہ
بند کر رکھا تھا۔ اس پوسٹ پر کیپٹن جاوید انور تھے جن کے پاس راشن تو تھا ہی نہیں،
ایمونیشن بھی محدود تھا۔ تاہم انہوں نے حاضر دماغی اور جرأت سے دشمن کا مقابلہ
کیا۔ دشمن کو توقع تھی کہ ایمونیشن ختم ہوتے ہی کیپٹن جاوید انور ہتھیار ڈال دے
گا یا پوسٹ چھوڑ کر اپنی پلاٹون کے ساتھ بھاگ جائے گا۔ صورت حال ایسی ہی
تھی لیکن آزاد کشمیر کا یہ نوجوان کپتان اور اس کے مٹھی بھر جوان جم کر لڑتے رہے۔

کرنل حق نواز کیانی شہید نے فوری طور پر جوابی کارروائی کا پلان تیار کر لیا اور
اپنے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر عطا محمد کو دکھایا۔ بریگیڈیئر کمانڈر نے ڈویژن کمانڈر
میجر جنرل عبدالمجید ملک کو رپورٹ دی جو اُس وقت مری میں تھے اور انہیں
حسینی والا سیکٹر سے تبدیل ہو کے آئے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا۔ میجر جنرل
عبدالمجید ملک ہیلی کاپٹر سے فوراً لیپا وادی پہنچے۔ فضا سے ہی اپنی اور
دشمن کی پوزیشنیں دیکھیں اور وادی میں اُترے۔ کرنل کیانی شہید کا پلان اُن کے
سامنے رکھا گیا۔ مزید سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ دشمن کی گولا باری اور حملہ
ایسی شدید نوعیت کا تھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اگر فوری طور پر
جوابی کارروائی نہ کی گئی تو دشمن پوری وادی پر غالب آجائے گا۔ جنرل مجید ملک
نے کرنل کیانی شہید کے جوابی حملے کی منظوری دے دی اور حملے کا وقت
۴/۵ مئی کی رات اڑھائی بجے مقرر کیا گیا۔

حملہ چک پترانام کے ایک ساڑھے نو ہزار فٹ بلند پہاڑ پر کرنا تھا۔
آزاد کشمیر فورس کی جنگی قوت صرف ایک پلٹن تھی جو مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں
پر مورچہ بند تھی۔ امدادی گولا باری کے لیے پیک بیٹری کی چار توپیں تھیں۔ یہ
چھوٹی چھوٹی دقیانوسی توپیں ہوتی ہیں جن کا گولا بمشکل تین میل تک جاتا ہے۔
ان کے ساتھ ۱۲۰ ملی میٹر کی صرف دو مارٹر گنیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں دشمن
کا پورا بریگیڈ تھا۔ اس کی مدد کے لیے دشمن کے توپ خانے کی یہ قوت تھی ——

بچانوے پونڈ کا گولا نو میل دُور تک پھینکنے والی چھ میڈیم توپیں، سات میل دُور تک گولے پھینکنے والی بارہ فیلڈ توپیں اور بیس مارٹر گنیں۔

رات کے وقت جوان پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ دشمن اُن کے سر کے اوپر مورچہ بند تھا۔ جوان بارودی سرنگوں میں سے پہاڑ کی عمودی چڑھائی چڑھتے چلے گئے۔ اور پہاڑ کی دو میل لمبی چوٹی پر جو معرکہ لڑا گیا اور دشمن سے یہ پہاڑ چھینا گیا، وہ ایک معجزہ تھا اور ایمان کی قوت کا بے مثال کرشمہ۔ کرنل کیانی نے یہ معجزہ نما معرکہ لڑایا اور ثابت کیا کہ قرآن پر ایمان ہو اور ایمان مستحکم ہو تو سورۂ الانفال کے مطابق بیس ایمان والے دو سو کفار پر غالب آسکتے ہیں۔

کرنل حق نواز کیانی شہید علامہ اقبال علیہ رحمتہ کے مردِ مومن کی مجسم تفسیر تھے۔ زاہد، پارسا، تصوف کے دلدادہ اور اللہ کے سپاہی۔ اکثر وِرد وظیفے کرتے رہتے تھے۔ قرآن ان کا تعویذ تھا۔ قرآنی بشارت پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا کردار اور جذبہ لیپا کی رفعتوں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ کشمیر ان کے اعصاب پر غالب رہتا تھا بلکہ ان کے خون میں رچ بس گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے افسروں کو وادئ کیان کی بلند و بالا پہاڑیاں دکھا کر اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے ——

"اگر ہم اس پہاڑ پر قبضہ کر لیں تو اس طرف کا دُور دُور تک کا علاقہ ہماری زد میں آجاتا ہے اور اگر فلاں پہاڑ لے لیں تو ہم آسانی سے مقبوضہ کشمیر کے اندر کمانڈوز بھیج سکتے ہیں" —— وہ اپنے جونیئر افسروں سے اکثر اس طرح سوال کرتے —— "بیٹا! سرینگر کو زد میں لینے کے لیے تم کونسا راستہ اختیار کرو گے؟"

—— اس طرح وہ نوجوان افسروں کے ذہن و دل میں کشمیر کو سمونے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کے دوران وہ مقبوضہ کشمیر کے دُور اندر تک کمانڈوز اپریشن کے لیے گئے تھے اور بے مثال دلیری سے دشمن کو کمر توڑ نقصان پہنچایا تھا جس کے صلے میں انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا تھا۔

۴/۵ مئی ۱۹۷۲ء کی رات انہوں نے لیپا وادی میں جو حملہ کرایا اس کے متعلق وہ جانتے تھے کہ عام جنگی قاعدوں کی رُو سے حملہ نہیں کیا جاسکتا نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اُوپر بیان کی ہوئی جنگی طاقت کے تناسب کا تقاضہ یہی تھا

رنا ہے تو دو پلٹنیں اور ایک توپ خانہ رجمنٹ بلاؤ ورنہ اپنے آپ
ریو والی ناڑ کو بلکہ تمام تر وادی کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دو، لیکن
کیانی شہید حیران کُن خود اعتمادی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ جنگی نوعیت
ایات افسروں کو دے چکے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ یہ عام قسم کی لڑائی
اور دشمن کو برتری بھی حاصل ہے اور وہ بلندی پر مورچہ بند ہے۔
ے علاوہ اپنے دستوں کی دیگر ضروریات کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے پاس
وردی بھی نہیں تھی۔ وہ خاکی وردی میں ملبوس تھے۔ یہاں تک کہ بعض
ں کے پاس جرابیں تک نہیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں دشمن برفانی
قے کی موزوں وردی میں ملبوس تھا۔ ہمارے پاس ایمونیشن کی بھی قلت تھی۔
ثمن بہت پیچھے تھا جہاں تک کا راستہ سیدھا نہیں بلکہ بے حد دشوار گذار
دو ہزار فٹ سے تیرہ ہزار فٹ تک اُوپر جاتا اور وہاں سے نیچے اُترتا تھا۔
کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے جوانوں کے سینوں میں ایمان کا شعلہ بھڑکانا
ی تھا۔ کرنل کیانی نے افسروں اور جوانوں کو وادی میں ایک جگہ اکٹھا کیا اور
ے خطاب کیا۔ یہ ان کی زندگی کا آخری خطاب تھا۔

انہوں نے جوانوں سے کچھ اس قسم کے الفاظ سے خطاب کیا کہ میرے بچو،
ات تمہیں جس مہم پر بھیجا جارہا ہے وہ ویسی لڑائی نہیں جو تم لڑتے رہے
ج تم اس دشمن پر حملہ کرنے جارہے ہو جس کی طاقت تم سے بہت زیادہ
وہ پہاڑ کے اُوپر مورچہ بند ہے۔ آج تمہیں وہ لڑائی لڑنا ہے جو اسلام
ہلے مجاہدوں نے لڑی تھی۔ آج تمہیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات
رہ کرنا ہے۔ کفار نے آج تمہاری غیرت کو للکارا ہے۔ آج کی رات تم
اصل کرو گے یا شہادت۔ قوم تمہیں دیکھ رہی ہے۔ آج قوم کا حق ادا
و۔

پھر کرنل کیانی شہید نے اپنے افسروں اور جوانوں کو اسلامی روایات یاد
، اور کہا کہ اللہ کے سپاہی سروں پر کفن باندھ کر لڑا کرتے تھے —— یہ کہہ کر
نے پتلون کی جیب سے کفن کا اُوپر والا حصہ نکالا اور اپنے سر پر لپیٹ

کر کہا ۔۔۔ "یہ میرا کفن ہے جو میں نے سر پر باندھ لیا ہے" ۔۔۔ کرنل کیانی شہید
ہر وقت کفن اپنے پاس رکھتے تھے جس پر عطر لگا ہوتا تھا۔ انہوں نے کفن باندھا
تو میجر محمد صابر خان شہید جو اس حملے کے قائد منتخب ہوئے تھے بول پڑے۔ انہوں
نے جیب سے رومال نکال کر سر سے باندھ لیا اور کہا ۔۔۔ "میرے پاس کفن نہیں
ہے۔ میں رومال کو کفن سمجھتا ہوں۔"

دونوں افسروں نے جوانوں کو آگ بگولا کر دیا۔ وہ فوج کے جوان نہ رہے
اللہ کے سرفروش جانباز بن گئے۔ میں نے وادی کیان میں جا کر وہ جگہ دیکھی جہاں
کرنل کیانی نے جوانوں سے خطاب کیا تھا۔ میں نے کئی ایک جوانوں سے اس
وقت کے تاثرات پوچھے جب کرنل کیانی شہید نے اپنے سر پر کفن باندھا
تھا۔ سب نے اس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا کہ جب ہمارے کمانڈنگ آفیسر اور
کمپنی کمانڈر نے کفن باندھے تو ہمارے اندر عجیب سی قوت پیدا ہو گئی اور ہم
بالکل بھول گئے کہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے اور وہ دس ہزار فٹ بلندی
پر ہے۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے دشمن ہمارے قدموں میں پڑا ہے۔

یہاں کرنل کیانی شہید کی بشارتوں کا ذکر ضروری ہے جیسا کہ اوپر بتا
چکا ہوں کہ وہ قرآن کے شیدائی تھے اور ہر بات اور ہر فیصلہ قرآن کی رُو سے
کرتے تھے۔ انہوں نے خطاب کے بعد اپنے جوانوں کو یہ بشارت دی ۔۔۔

"تم جس طرف سے پہاڑ پر چڑھو گے وہاں دشمن نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔
میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی بارودی سرنگ نہیں
پھٹے گی۔ یہ اشارہ مجھے قرآن پاک سے ملا ہے۔ دوسرا یہ کہ دشمن اندھا ہو جائے
گا۔ اسے تمہاری نفری بہت زیادہ نظر آئے گی۔"

اور ہُوا بھی ایسے ہی۔ جوان جب رات کی تاریکی میں مکمل خاموشی سے
یہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے تو انہیں محسوس تک نہ ہُوا کہ وہ بارودی سرنگوں (مائن
فیلڈ) میں سے گذر رہے ہیں۔ کوئی ایک بھی جوان بارودی سرنگ سے زخمی
نہ ہوا۔ اگر ایک بھی بارودی سرنگ پھٹ جاتی تو صرف یہ نہیں کہ کوئی جوان زخمی یا
شہید ہو جاتا بلکہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ سرنگ کے دھماکے سے دشمن

یار ہو جاتا اور وہ بلندی سے ہمارے حملہ آور دستوں کو گرینیڈوں اور مشین گنوں
کر دیتا۔ حملہ جس خاموشی سے کرنا تھا وہ ٹوٹ جاتی ۔۔۔ پھر جب اوپر
ڑا گیا اور دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے تو سکھ بھاگنے لگے۔ وہ بارودی سرنگیں
یتر کے جوانوں کے پاؤں کے نیچے نہیں پھٹی تھیں سکھوں کے قدموں
ے لگیں اور ان کے پرخچے اڑا دیے۔

کرنل کیانی شہید کی دوسری پیشین گوئی بھی بالکل صحیح ثابت ہوئی تھی۔
ھوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ آزاد کشمیر کے جوانوں نے ایسی بے جگری سے
ملہ کیا کہ سکھ دیوار کے بہت موٹے موٹے تنوں کے بنائے ہوئے بنکروں
یہ بند ہونے کے باوجود بے طرح بھاگے یا ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے
لئے مگر کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔

کرنل کیانی شہید نے جنگی فہم و فراست کا ایک دلچسپ مظاہرہ بھی کیا
اس طرح کہ جہاں انہوں نے جوانوں سے خطاب کیا تھا وہ جگہ دشمن کو نظر
سکتی تھی۔ دشمن بلندی پر تھا جہاں سے اسے وادی کا تمام علاقہ نظر آتا
اب کے بعد کرنل کیانی شہید نے جوانوں کو ایک قطار میں کھلے علاقے
جا کر ایسی جگہ سے ندی پار کرائی جہاں دشمن انہیں دیکھ سکتا تھا۔ ندی
ا کر جوان دشمن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ آگے لے جا کر
ر کو پھر ادھر لایا گیا اور پھر وہیں سے ندی پار کرائی گئی۔ اس طرح انہوں
ل کئی بار دہرایا۔ دشمن بلندی سے دیکھ رہا تھا کہ مسلمانوں کی نفری ختم
ہوتی۔ ان کی نگاہ میں یہ تو پورے بریگیڈ کی نفری تھی مگر یہ بمشکل
تین سو جوان تھے جو کرنل کیانی شہید نے ایسے طریقے سے دشمن کے
سے گزارے کہ اڑھائی تین ہزار بن گئے۔

اور ان مٹھی بھر جوانوں نے جب چک پترا کی بلندی پر حملہ کیا تو وہ گوشت
کے اڑھائی تین سو جوان نہیں تھے۔ وہ آگ کے بگولے تھے اور یہ
ن اور ایمان کی تھی۔ ایسا شدید اور قہر آلود حملہ تھا کہ دشمن کو یقین ہو
ایک کمپنی نہیں یہ دو تین پلٹنیں ہیں جو انہوں نے شام کے وقت ندی

پار کرتے دیکھی تھیں۔

قرآن اور ایمان کی قوت کے علاوہ کرنل کیانی شہید کی پُرعزم اور پُرعظ
شخصیت کا بھی جوانوں پر اثر تھا اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی احساس تھا
ان کا جرنیل، میجر جنرل عبدالمجید ملک بھی ان کے قریب موجود ہے اس لڑا
اور انتہائی پُرخطر حملے کا فیصلہ جنرل مجید ملک نے ہی کیا تھا۔ افسروں اور جوا
کو احساس تھا کہ ان کے جرنیل نے اپنی جرنیلی کو خطرے میں ڈال کر یہ فیصلہ
کیا ہے ورنہ کوئی جرنیل اس نوعیت کے حملے کا حکم نہیں دیا کرتا۔

کرنل کیانی شہید کو اپنی شہادت کی بھی بشارت ہو گئی تھی۔ اس کا ثبو
ان کے ان خطوط سے ملتا ہے جو انہوں نے شہادت سے تین روز پہلے
مئی ۱۹۷۲ء کے روز پاکٹ ڈائری میں سے پھاڑے ہوئے اوراق پر اپنی وا
صاحبہ، اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کو لکھے تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کو لکھا۔

۷۸۶/۹۲ لیپا ویلی۔ کرناہ

یکم مئی۔ بمطابق ۱۶ ربیع الاوّل

بخدمت جنابہ میرے قبلہ و کعبہ جنابہ والدہ صاحبہ

اسلام علیکم

میری پیاری والدہ صاحبہ یہاں پر چند دنوں تک کچھ
حالات کی خرابی کی وجہ سے جنگ ہونے والی ہے۔ ایسے حالات
میں زندگی کا پتہ نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں نے تو اپنے آپ کو اللہ
کے حوالے کیا ہوا ہے جیسے اس کی مرضی۔ انشاء اللہ آخری
دم تک کفار کا مقابلہ کریں گے۔ بے جی، آپ کی دعاؤں کی ضرورت
ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے عزت سے زندہ رکھیں
اور عزت سے ماریں۔ آمین ثم آمین۔ میری پیاری بے جی! اگر
خداوند تعالیٰ نے اس دفعہ قبول کر لیا تو آپ غم نہ کریں کیونکہ
اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔ والدین کو اپنی اولاد کی جوانی
(کی موت) کا دکھ تو بہت ہوتا ہے لیکن اس میں کسی کا دخل

نہیں تو پھر شہادت خداوند تعالیٰ جس کو نصیب فرما دے وہ تو
بہت خوش قسمت ہوتا ہے۔

اصغر، جالنوا اور خانو بھی تو آپ کے بچے ہیں۔ انشاء اللہ
سب آپ کے تابعدار ہیں۔

قبلہ والدہ صاحبہ، آپ کی خدمت میں پھر عرض ہے کہ مجھ
پر راضی رہیں۔ میں انشاء اللہ اگلے جہاں میں بھی تابعدار رہوں
گا۔

نورِ چشم — حق نواز

اسی روز انہوں نے ایک خط انگریزی میں اپنے بیٹے اصغر نواز کیانی
کو لکھا۔ اصغر ملٹری کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے فوج میں کمشن کے لیے
درخواست دے رکھی تھی۔ کرنل کیانی شہید نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ ان
کا بیٹا فوج میں جا رہا ہے، خط میں لکھا۔

۷۸۶/۹۲

لیپا ویلی

یکم مئی ۱۹۷۲ء

میرے پیارے بیٹے! خدا ہر حال میں تمہارے ساتھ
رہے۔ تم سب سے جُدا ہوتے وقت تمہاری کامیابی اور
تمہارے خوش آئند مستقبل کے لیے دُعاگو ہوں۔ افسر کی
حیثیت سے اپنے آپ میں سخت محنت کی عادت ڈالو۔ اپنے
فرائض کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دو اور اپنے جوانوں کو
پوری توجہ دینا۔ ان سے پورے خلوص سے پیش آنا۔ اپنے جوانوں
کو اور اپنے آپ کو بھی اپنی کمانڈ میں رکھنا اور اللہ اور اسلام
کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہنا۔ اپنے فن میں
پوری تربیت حاصل کرنا۔ ہر زاویے اور رموز کو سمجھنا تاکہ تم ایک
قابل افسر بن سکو.... میرے پیارے بیٹے، یاد رکھو کہ بہت

جلدی تمہیں میری جگہ لینی ہے۔ میں تم سے ایسے وقت جُدا ہو رہا ہوں جب تم ماشاء اللہ جوان ہو چکے ہو۔ جب تمہارے دادا جان فوت ہوئے تھے تو میں بہت چھوٹا تھا۔ اپنی پیاری والدہ اور بہنوں اور بھائیوں کا خیال رکھنا۔ ان سے سختی نہ کرنا۔

خدا حافظ

تمہارا والد

اپنے بڑے بھائی کو بھی انہوں نے اسی روز خط لکھا۔ یہ خط بھی انگریزی میں ہے۔

۷۸۶
۹۲

لیپا ویلی
یکم مئی ۱۹۷۲ء

قبلہ بھائی صاحب! میں آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ بڑھاپے کے باوجود میری اور میرے کنبے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ فرض تو میرا تھا کہ میں آپ کی دیکھ بھال کرتا۔ افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ میں خداوند تعالیٰ کے حضور سر جھکاتا ہوں جس نے مجھے (شہادت کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔ میں چہرے پر مسکراہٹ لیے ہوئے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں اپنے پیچھے اپنے بچوں، ان کے بچوں اور ان کے بچوں کے لئے ایک راستہ چھوڑ چلا ہوں تاکہ وہ اس راستے پر میرے نقوشِ پا پر چلیں۔ اللہ میری اس خواہش کو قبول فرمائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی رفیقۂ حیات "عنایت" کو زندگی کی پوری مسرتیں نہ دے سکا۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو۔

یہ لگتا تو عجیب سا ہے لیکن آنے والے واقعات پہلے سے ہی اپنا سایہ ڈال دیتے ہیں۔

آپ کا بھائی ـــــ حق نواز

کرنل کیانی شہید نے اپنے بیٹے اور برادرِ بزرگ کے خطوط میں صاف

لکھ دیا تھا کہ خدا نے انہیں شہادت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ یہ بھی ایک بشارت تھی جو انہیں قرآن سے حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے محترمہ والدہ صاحبہ کو تو ذرا سنبھل کر خط لکھا ہے لیکن بیٹے اور بھائی کو بتا دیا تھا کہ وہ ان سے رخصت ہو رہے ہیں۔ انگریزی میں خط لکھنے کی غالباً وجہ یہ تھی کہ ان کی والدہ کو پتہ نہ چل جائے کہ ان کا بیٹا شہید ہو رہا ہے۔

کرنل کیانی شہید کے جوان میجر محمد صابر خان شہید اور میجر یار افضل آفریدی کی قیادت میں پہاڑ پر کس طرح چڑھے تھے، اتنی طویل کہانی کا اعادہ ممکن نہیں۔ تقریباً ایک ہزار فٹ اُوپر گئے تو پتہ چلا کہ اسّی جوان جو سکاؤٹس کے تھے لاپتہ ہو گئے ہیں، وہ غالباً راستہ بھٹک گئے تھے کیونکہ رات کا اندھیرا تھا اور پہاڑ کے خدوخال گمراہ کن تھے۔ اسّی جوان اس مختصر سی فورس کا تیسرا حصّہ تھے۔ وائرلیس پر کرنل کیانی شہید کو جو ایک اور پہاڑی پر کھڑے حملے کو کنٹرول کر رہے تھے، اطلاع دی گئی کہ اسّی جوان لاپتہ ہو گئے ہیں۔ نفری پہلے ہی کم تھی، اب اس کا بھی تیسرا حصّہ لاپتہ ہو گیا۔ کرنل کیانی شہید نے حکم دیا کہ چڑھائی جاری رکھو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے حملہ ملتوی نہیں ہو گا۔

چک پترا کے پہاڑ سے ذرا ہٹ کر ایک آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑ پر کرنل کیانی شہید کا ایک دستہ مورچہ بند تھا۔ اس کے کمپنی کمانڈر علاقہ پوٹھوہار کے رہنے والے میجر جمشید گلزار تھے جو ایکس سروسز ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد گلزار خان کے بیٹے ہیں۔ ان سے ایک پلاٹون پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ کرنل کیانی شہید نے میجر جمشید گلزار کو وائرلیس پر ہدایت دی کہ اپنی پوسٹ سے نیچے آؤ اور اپنی سمت سے (یعنی پہاڑ کی دوسری سمت سے) چک پترا پر حملہ کرو۔ میجر جمشید گلزار کو آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑ سے اُترنا اور پھر ساڑھے نو ہزار فٹ پہاڑ پر چڑھنا اور سستائے بغیر حملے میں شریک ہونا تھا۔ یاد رہے کہ پہاڑ سے اُترنا چڑھنے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تاہم میجر جمشید گلزار اس پہاڑ سے اُترے اور اس پہاڑ پر چڑھے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں اپنے وائرلیس سیٹ

پر کرنل کیانی شہید کی آواز سنائی دیتی رہی۔ کرنل کیانی شہید انہیں بٹیا یا جمی بٹیا کہا کرتے تھے۔ انہوں نے میجر جمشید گلزار کو قرآن پاک کی ایک آیت سنا کر کہا کہ ان مقدس الفاظ کا وِرد کرتے ہوئے جاؤ، بارودی سرنگیں اور دشمن کی مشین گنوں اور گولا باری کی آگ تمہیں راستہ دے دے گی۔

گولا باری اور دیگر فائرنگ کا یہ عالم تھا کہ پہاڑ غبار میں چھپ گئے تھے۔ دیودار کے درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گر اور جل رہے تھے اور فضا میں گولیوں نے آگ کی لکیروں کا جال تن رکھا تھا۔ یہ آتشِ نمرود تھی جس میں سے میجر جمشید گلزار اور ان کے جوان گزر گئے۔ اس دوران کرنل کیانی شہید اپنی پوزیشن میں کھڑے حملے کو کنٹرول کر رہے تھے اور کوئی ورد بھی کر رہے تھے۔

میجر جمشید گلزار نے اپنے تاثرات اپنے والد صاحب کرنل گلزار صاحب کے نام ایک خط میں لکھے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کو لیپا کی ان بلندیوں سے جہاں دنیا کی کوئی خبر نہیں پہنچ سکتی ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے لکھا۔

"میری بہت ہی پیاری امی جان۔ اسلام علیکم

یہاں نہ تو میرے پاس اخبار آتی ہے اور نہ ہی کوئی ریڈیو ہے کہ میں دنیا کا حال جان سکوں۔ زیادہ تر وقت مورچے بنانے اور اپنے دفاع کو مضبوط کرنے میں گزر جاتا ہے۔ نہ جانے لڑائی کب لگ جائے اس لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ ہماری بدقسمتی اور ہمارے اعمال کی سزا کی وجہ سے ہندو ہمارے سروں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہاں پر ہمارے کچھ علاقے پر قابض ہے۔ انشاء اللہ موقع ملتے ہی اور آپ کی دعاؤں سے جب کبھی لڑائی ہوئی دشمن کو باہر دھکیل کر دم لوں گا اور جامِ شہادت نوش کروں گا۔ ہندوستان کے ہاتھوں بہت رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خدا نے چاہا تو اس سے بڑھ کر ذلت اور رسوائی ہندوستان کو اُٹھانی پڑے گی۔"

آپ کا بہت ہی پیارا بیٹا

جمشید

یہ خط لیپا وادی کے معرکے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ معرکے کے بعد میجر جمشید گلزار نے اپنے والد صاحب کو ایک طویل خط میں معرکے کی تفصیلات اور کرنل کیانی شہید کی عظمت کے تاثرات ان الفاظ میں لکھے۔

"پیارے آبا جی! السلام علیکم۔

آپ نے لیپا اپریشن کے متعلق بے شمار باتیں سنی ہوں گی لیکن اس کی اصل تصویر اس طرح ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھارتیوں نے نفری اور جنگی سامان کی بے پناہ افراط کے بل بوتے پر لیپا وادی کے خاصے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ کے بعد انہوں نے ایسا جارحانہ انداز اختیار کر لیا کہ ہمارے دستوں کی حیثیت حقیر سی ہو کے رہ گئی۔ بھارتی تمام بلندیوں پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خطرہ ہر لمحہ ہمارے سر پر سوار رہتا تھا کہ وہ ہمیں مظفر آباد کی طرف دھکیل دیں گے۔ انہوں نے ہمیں کئی بار دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ ہم یہ علاقہ خالی کر دیں۔ ہم چونکہ پستیوں میں مورچہ بند تھے اس لیے اس طرح لگتا تھا جیسے ہم ان بھارتیوں کے جو بلندیوں پر بیٹھے تھے، قدموں میں بیٹھے ان کے پاؤں چاٹ رہے ہیں۔ ٹریجیڈی یہ ہوئی کہ آزاد کشمیر کی بٹالین کی ایک کمپنی فائر بندی کے بعد چاروں طرف دشمن کے گھیرے میں رہ گئی۔ اسے راشن وغیرہ پہنچانے کے لئے تنگ سا ایک راستہ تھا اور یہ راستہ بھی دشمن کے رحم و کرم پر تھا۔۔۔۔

"فائر بندی سے ہی کھچاؤ جاری رہا۔ بھارتیوں کی نظر وادی کے باقی حصے پر بھی لگی ہوئی تھی جسے حاصل کرنے کی وہ ایک عرصے سے کوشش کر رہے تھے۔ ادھر ہمارے جوانوں کی جذباتی کیفیت یہ تھی کہ ان کے دلوں میں دشمن کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یکم مئی ۱۹۷۲ء کے روز بھارتیوں نے ہماری محصور کمپنی کی سپلائی کا راستہ اس خیال سے بند کر دیا کہ یہ کمپنی راشن اور ایمونیشن وغیرہ کی کمی سے گھبرا کر ہتھیار ڈال دے گی یا پوسٹ خالی کر جائے گی۔ دشمن نے جب دیکھا کہ کمپنی پر کچھ اثر نہیں ہوا تو ۳/۴ مئی ۱۹۷۲ء کی رات کیان

کے مقام پر دشمن نے مارٹر گنوں اور توپ خانے کی قیامت خیز گولا باری شروع کر دی۔ دشمن اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ ہماری نفری اور فائر پاور بہت تھوڑی ہے اس لیے وہ ہم پر آسانی سے غالب آ جائے گا مگر اسے اس قوت کا اندازہ نہیں تھا جو ہماری روحوں میں بھری ہوئی تھی اور وہ اس خدائی مدد کو بھی بھول گیا تھا جو ہمیں حاصل تھی ....

"ہمارے محصور جوانوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے جم کر مقابلہ کیا اور دشمن کو جانی نقصان پہنچا کر حملہ ناکام بنا دیا۔ ۴ مئی ۱۹۷۲ء کی صبح دشمن نے ہماری تمام پوسٹوں پر بے پناہ گولہ باری شروع کر دی۔ لیپا وادی کا ذرّہ ذرّہ بھارتیوں کی گولاباری سے لرز رہا تھا۔ ساری وادی ہل رہی تھی اور سیاہ دھوئیں اور گرد میں روپوش ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں کے غریب سے باشندے خوف اور دہشت سے کونوں کھدروں میں چھپ گئے۔ سارا دن بھارتیوں کا قہر برستا رہا اور بڑھتا ہی رہا ....

"اس قیامت میں خدا کا برگزیدہ انسان، کرنل کیانی، اتنی ہی قلیل نفری اور جنگی قوت سے جو ہمارے پاس تھی، دشمن پر بجلی بن کر گرنے کی سکیم بنانے میں مصروف تھا۔ کوئی کمانڈر اس صورتِ حال میں جب دشمن دس گنا طاقتور ہو اور اسے زمین کی برتری بھی حاصل ہو، جوابی حملہ کرنے کی نہیں سوچ سکتا لیکن کرنل کیانی ان دنیاوی امور سے بلند تھے۔ ۵ مئی ۱۹۷۲ء کی سحر کے ساڑھے تین بجے مجھے کرنل کیانی شہید کا وائرلیس پیغام ملا کہ جس طرح تم بہتر سمجھتے ہو دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ میجر صابر شہید کو بھی حملے کا حکم مل چکا تھا۔ کرنل کیانی نے مجھے وائرلیس پر کہا کہ اپنے تمام جوانوں کو بتا دو کہ دشمن تمہیں دیکھ کر اندھا ہو جائے گا اور اس کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی اور دشمن کی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہے، وہ کچلا جائے گا ....

"میں نے اپنے شیر دل جوانوں کو حملے کے احکام دیئے۔ جوان اسی حکم انتظار بے تابی سے کر رہے تھے اور جب صبح کی پہلی کرن پھوٹ رہی تھی، ہم دشمن پر بھوکے چیتے کی طرح جھپٹ پڑے۔ میرا ہر ایک جوان انتقام کے جذبے

سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ہمارا حملہ اس قدر قہر آلود اور اس قدر دلیرانہ تھا کہ مشین گنوں، مارٹر گنوں، توپوں، آر آر گنوں اور گرینیڈوں نے ہمارے راستے میں آگ کی جو دیوار کھڑی کر رکھی تھی، وہ ہم نے بے خوف و خطر عبور کر لی۔ میرے جوان آگ کے اس سمندر میں خدائی مدد سے دشمن پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔ واللہ وہ کیا جذبہ تھا۔ انہوں نے بنکروں پر ہلّہ بول دیا۔ ایک ایک بنکر میں کود کر وہ سنگینیں دشمن کے دلوں میں اتار رہے تھے۔ ان کی کھوپڑیاں کھول رہے تھے، ان کے پیٹ چاک کر رہے تھے۔ وہ دشمن کو درد سے چیختا چلاتا اور موت کی اذیت میں تڑپتا چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے ....

"میں غصّے سے پاگل ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنے وہ ہزاروں بھائی آ گئے جنہیں دشمن نے قید میں ڈال رکھا ہے اور جنہیں دشمن کئی بار ذلیل و رسوا کر چکا ہے۔ وہ دشمن اب ہماری چمکتی ہوئی ننگی سنگینوں کے سامنے تھا۔ کافر ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا رہے تھے۔ رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ سکھ سپاہی جو دھمکی کی زبان میں بات کیا کرتا تھا اور جو تکبّر سے گردن اکڑائے رکھتا تھا، ہمارے قدموں میں ہمارے رحم و کرم پر پڑا تھا۔ یہ فیصلہ ہمارے ہاتھ میں تھا کہ سنگین اس کے جسم میں اتار دیں یا اسے بخش دیں۔ سکھ سپاہی اس دن کو کوس رہے تھے جس دن وہ پیدا ہوئے تھے۔ ان کی گیدڑ بھبکیاں دم توڑ گئی تھیں اور خون کی راہ ان کے کٹے پھٹے جسموں سے بہ کر مٹی میں رل رہی تھیں ....

"دن کے پچھلے پہر تک ہم نے دشمن سے چک پترا چھین لیا اور دفاعی پوزیشنیں قائم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اچانک دشمن نے تازہ دم نفری سے جوابی حملہ کر دیا اور میڈیم، فیلڈ توپوں اور مارٹر گنوں کی شدید گولا باری ہم پر مرکوز کر دی۔ ہم نے ایک بار پھر خدا سے مدد مانگی۔ ہمارے پاس نہ کمک تھی نہ ایمونیشن۔ ہم اللہ کے بھروسے پر لڑ رہے تھے۔ میجر صابر خان میرے سامنے شہید ہو گئے ـــــ صرف ایک سو گز دور ـــــ میں ابھی زندہ تھا۔ مجھے خراش تک نہیں آئی تھی۔ میں نے فوراً میجر صابر شہید کی کمپنی کی کمان لے لی۔ مجھے خدا نے شاید اسی مقصد کے لیے زندہ رکھا تھا ....

"دشمن کے تازہ دم دستے موج در موج حملے کے لیے آ رہے تھے۔ وہ جے ہند کے نعرے لگاتے آتے تھے اور جب میرے جوانوں کی مشین گنیں آگ اگلتی تھیں تو جے ہند کے نعرے موت کے آخری خراٹوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا سکھ لڑکھڑاتا، گرتا اور مرتا تھا . . . . دشمن کا جوابی حملہ اس کیفیت میں پسپا کر دیا گیا کہ دشمن بوکھلا گیا اور سمجھ ہی نہ پایا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ بچا کھچا دشمن لاشوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ زخمی پانی مانگ رہے تھے مگر اب پانی خون کی کمی پوری نہیں کر سکتا تھا . . . . دشمن کے کمانڈر جو پہلے دھمکیاں دیتے تھے، اب فائر بندی کی التجائیں کر رہے تھے۔ ہماری حکومت نے ۶ مئی کی شام فائر بندی کی درخواست قبول کی۔ . . .

"ہماری اس کامیابی میں خدا کا ہاتھ ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے مردِ مومن کرنل کیانی کو اپنے کرم اور راہنمائی سے نوازا تھا۔ کرنل کیانی دشمن کی پسپائی کے بعد شہید ہو گئے۔ توپ خانہ بیٹری کمانڈر میجر غلام احمد بھی ان کے ساتھ ہی شہید ہو گئے۔ کرنل کیانی شہید کا آخری پیغام مجھے وائرلیس سے اس وقت ملا تھا جب میں تھوڑے سے وقت میں بہت سا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ انہوں نے مجھے آہستہ اور احتیاط سے بڑھنے کی ہدایت دی۔ اس سے پہلے انہوں نے مجھے وائرلیس پر بار بار کہا تھا ــ 'بیٹے، دشمن بھاگ رہا ہے . . . . دشمن اندھا ہو چکا ہے . . . . جمی بیٹے، دشمن سے اپنی شکست کا بدلہ لو' . . . .

"کرنل کیانی کے یہ الفاظ مجھ پر دیوانگی طاری کر رہے تھے اور میں محسوس کرنے لگا کہ میں گوشت پوست کا وہ جسم نہیں رہا جو گولیوں کی بوچھاڑوں سے بیکار ہو جائے گا۔ میں سراپا روح بن گیا تھا اور یہ روح بجلی کی طرح آگے ہی آگے آگ میں بڑھتی جا رہی تھی . . . . اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تمام جنگی قیدی جو دشمن کی قید میں ہیں میرے دوش بدوش لڑ رہے ہیں اور اپنی رسوائی کا انتقام لے رہے ہیں۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ میری بہادری نہیں تھی۔ یہ میری ذات کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے اس جذبے کا قہر تھا جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑا تھا اور یہ دشمن کے خلاف اس حقارت کا کرشمہ تھا جو میرے دل میں بھری ہوئی

تھی۔ فوجوں کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جہاں کسی نے اس طرح کے غیر سپاہیانہ طریقے سے کسی کی فوج کو قید میں ڈال دیا ہو . . . .

"ہمیں پسپا اپریشن لڑے دو مہینے گزر گئے ہیں۔ دشمن کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور اب اس کا انداز بتا رہا ہے کہ اسے اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں غلط سمجھا تھا . . . . دعا ہے کہ خدا ہمیں اپنے وقار کے تحفظ کی ہمت عطا فرمائے اور ہمیں مزید فتوحات سے نوازے۔ آمین"۔

آپ کا بیٹا ــــ جمشید

کرنل کیانی شہید ایسے مقام پر تھے جہاں شہادت کے امکانات بہت ہی کم تھے مگر ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں شہادت کی بشارت ہو چکی تھی۔ وہ معرکے والے پہاڑ سے خاصا پیچھے ایک اور پہاڑی "چا ننیاں رج" پر محفوظ مورچے میں تھے۔ ان کے ساتھ بیٹری کمانڈر میجر غلام احمد تھے۔ ان کا ملاپ حملہ آور دستوں سے تھا۔ وہ وائرلیس کے ذریعے ہدایات دے رہے تھے اور میجر غلام احمد گولا باری کرا رہے تھے۔ کرنل کیانی لڑنے والے جس کمانڈر سے بھی بات کرتے تھے یہ ضرور کہتے تھے ــــ "بیٹا دشمن اندھا ہو چکا ہے . . . اپنی شکست کا بدلہ لو"۔

آخر انہیں وائرلیس پر یہ خوشخبری سنائی گئی کہ چک پترا کا پورا رج (پہاڑ) فتح کر لیا گیا ہے۔ کرنل کیانی اپنی محفوظ پوزیشن سے باہر نکلے۔ ان کے ساتھ میجر غلام احمد، حوالدار گلزار، لانس نائک کبیر اور لانس نائک ذاکر حسین تھے۔ اچانک مارٹر گن یا توپ کا ایک گولا ان کے درمیان آن پھٹا۔ اس سے کرنل کیانی، میجر غلام احمد اور لانس نائک کبیر موقع پر ہی شہید ہو گئے اور حوالدار گلزار اور لانس نائک ذاکر حسین زخمی ہوئے۔ کرنل کیانی شہید کے سر پر کفن بندھا ہوا تھا جس پر عطر لگا ہوا تھا اور یوں آزاد کشمیر فورسز کا یہ عظیم افسر آزاد کشمیر کو بھارتی استبداد سے آزاد کرانے کے جنون کو معطر کفن میں لپیٹے ہوئے خدا کے حضور لے گیا۔

کرنل حق نواز کیانی شہید کو ایک بار پھر ستارۂ جرأت دیا گیا۔

کرنل کیانی شہید عظمت کا وہ مینار تھا جو گرا نہیں کرتے۔ جان دے کر ان کی

رفعتیں عرش سے جا ملتی ہیں اور وہ ایک روایت بن کر قوم کے سینے میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

سوار محمد حسین شہید، نشانِ حیدر

یہ پاک فوج کے ایک سپاہی کی بے مثال جرأت کی کہانی ہے جو نئی بھی ہے اور صدیوں پرانی بھی ـــــ نئی اس لیے کہ یہ پہلا سپاہی ہے جس نے پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز "نشانِ حیدر" حاصل کیا ہے۔ اور پرانی اس لیے کہ اس سپاہی نے تیرہ سو چونتیس سال بعد قادسیہ کی کہانی کو دُہرایا ہے جہاں آتش پرست، مسلمانوں کو فیصلہ کُن شکست دینے کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لائے تھے۔ یہ لشکر زرہ پوش تھا۔ اس کے آگے زرتشت کے پجاریوں نے ہزاروں ہاتھیوں کی سیاہ دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ ہاتھیوں کے سروں اور سونڈوں پر آہنی خول چڑھے ہوئے تھے۔ اس طرح ہاتھیوں اور انسانوں کا یہ تمام تر لشکر بکتر بند تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی کل نفری چھتیس ہزار غیر بکتر بند تھی۔

زرتشتوں کے اس لشکر کا کمانڈر رستم تھا اور مسلمانوں کا سپہ سالار سعدؓ بن ابی وقاص۔ زرتشتوں کے بکتر بند لشکر نے اسلام کی تاریخ کو بے حد خطرناک اور نازک موڑ پر کھڑا کر دیا تھا لیکن جنگ کے دوسرے دن سعدؓ بن ابی وقاص کے ایک سپاہی بلال نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر بلند آواز سے اپنے ساتھیوں کو پکارا اور کہا ـــــ "ادھر آؤ، ربِ کعبہ کی قسم، میں نے رستم کو ہلاک کر دیا ہے" ـــــ اور اس کے بعد مسلمانوں کو فیصلہ کُن شکست دینے والا زرہ پوش لشکر اور اس کے ہاتھی غیر بکتر بند مسلمانوں کے ہاتھوں ایسی شکست کا شکار ہو گئے جو ہر لحاظ سے فیصلہ کُن ثابت

ہوئی۔

یہ جنگ ۶۳۷ عیسوی میں لڑی گئی تھی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک فوج کے ایک سپاہی نے نارووال کی سرحد کی ایک ٹیکری پر کھڑے ہو کر سعدؓ بن ابی وقاص کے سپاہی بلال کی للکار کو دُہرایا اور ماں باپ کا یہ اکلوتا بیٹا اپنے نوزائیدہ اکلوتے بیٹے کی صورت دیکھے بغیر اپنے خون سے تاریخ اسلام کو زندہ کر گیا۔

یہ کہانی شکر گڑھ سیکٹر کے ایک گوشے کی روئیداد ہے جو تھا تو محدود اور چھوٹا سا لیکن شجاعت کا وہاں سب سے بڑا کارنامہ ہُوا۔ یہاں پاک فوج کی صرف ایک ٹینک رجمنٹ دفاع میں تھی جس کے پاس دقیانوسی اور عمر خوردہ شرمن ٹینک تھے۔ اب اس رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل طفیل محمد اور ان کے تین سکواڈرن کمانڈر میجر روشن اعجاز، میجر محمد اکرم اور میجر عبدالرشید اور ان کے دیگر افسر اور جوان ان عمر خوردہ ٹینکوں کو جن کے انجنوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی تھی، اپنا خون پسینہ، فہم و فراست اور اپنی زندگی دے کر چلا رہے تھے۔

اس ایک ٹینک رجمنٹ کو دفاع کے لیے جو علاقہ دیا گیا تھا، وہاں دشمن نے دو آرمرڈ بریگیڈوں یعنی ٹینکوں کے دو بریگیڈوں سے حملہ کیا تھا۔ دشمن کے ہر ایک بریگیڈ میں چار ٹینک رجمنٹیں تھیں۔ یعنی ہماری ایک رجمنٹ کا مقابلہ آٹھ رجمنٹوں سے تھا۔ قوت کے اس بھیانک تفاوت کے علاوہ دشمن کے پاس روس کے جدید ترین ٹی ۵۵ ٹینک تھے جو رات کے وقت بھی دیکھ سکتے ہیں دشمن کے پاس سنچورئن ٹینک بھی تھے جو رات کے وقت استعمال نہیں کیے جاسکتے چنانچہ دشمن دن کے وقت سنچورئن اور ٹی ۵۵ اور رات کے وقت صرف ٹی ۵۵ استعمال کرتا تھا۔

ٹینکوں کی خوبیوں اور خامیوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھیئے۔ دشمن کے سنچورئن ٹینکوں کی بڑی توپیں تین ہزار گز تک گولا پھینک سکتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں ہلے شرمن ٹینکوں کی توپوں کی مار صرف ڈیڑھ ہزار گز تھی۔ زیادہ سے زیادہ گولا دو ہزار گز تک جا سکتا تھا۔ اپنے ٹینکوں کی یہ کمزوری دشمن کے دُور مار ٹینکوں کے لیے بہت ہی سُود مند تھی۔ اس کے علاوہ شرمن ٹینک اتنے اونچے ہیں کہ دشمن کے

لیے بہت بڑا اور نہایت آسان ٹارگیٹ بنتے ہیں۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ہماری فوج کے پاس اتنے قدیم اور اتنے تھوڑے ٹینک کیوں تھے تو میں اس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ یہ ان ڈکٹیٹروں سے پوچھیئے جنہوں نے تیرہ سال ہم پر حکومت کی اور امریکہ سے نقد امداد لے کر عیش و عشرت میں مدہوش رہے جب کہ ہمارا دشمن جنگی قوت بنانے میں معروف رہا۔ ہم جشنِ ترقی مناتے رہے، اُدھر جنگی تیاریاں ہوتی رہیں۔ ادھر طبلے بجے اُدھر طیارے اکٹھے ہوتے رہے۔

میں اُن حضرات سے خاص طور پر مخاطب ہوں جو یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ہماری فوج شکست خوردہ ہے۔ جس فوج کو ہم نے اس قدر پرانے اور بیکار ٹینک دے کر ایسے دشمن کے خلاف لڑایا جو اس سے آٹھ گنا طاقتور اور جدید ٹینکوں سے مسلّح تھا، اس فوج پر نکتہ چینی کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری فوج نے انہی تھوڑے سے اور بیکار ٹینکوں سے دشمن کا کامیاب مقابلہ کر کے دکھا دیا تو یہ کہنے کی بجائے کہ ہماری فوج بیکار ہے، ہمارے سر فخر سے اُٹھ نہیں سکتے تو ندامت سے جُھک جانے چاہئیں۔

پیشتر اس کے کہ میں سوار محمد حسین شہید نشانِ حیدر کی داستانِ شجاعت سناؤں، مختصراً بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے دقیانوسی اور اتنے تھوڑے ٹینکوں کی اس ایک رجمنٹ کو چودہ میل لمبا علاقہ دے کر یہ ذمّہ داری سونپی گئی تھی کہ دشمن کے حملے کو اڑتالیس گھنٹوں تک روکے رکھے لیکن اڑتالیس گھنٹوں کی بجائے اس رجمنٹ نے پورے چودہ دن دشمن کو روکے رکھا۔ دشمن کو جو نقصان پہنچایا گیا اس کا مجموعی حساب کتاب لگایا جائے تو اس کی تقریباً دو ٹینک رجمنٹوں جتنے ٹینک بالکل تباہ کر دیئے گئے تھے اور اس کے انفنٹری ڈویژن کی جو نفری ہلاک کی گئی وہ کم و بیش ایک بریگیڈ جتنی تھی۔ اس کے مقابلے میں اپنے صرف سات ٹینک ضائع ہوئے۔

سوار محمد حسین میجر محمد اکرم کے سکواڈرن میں تھا جس کے سیکنڈ اِن کمانڈ

کیپٹن انیس احمد خان تھے۔ ان کے علاوہ اس سکواڈرن میں دو نوجوان افسر
تھے جنہیں میں فوجی یا جنگی عمر کے مطابق کمسن کہوں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ دونوں ٹروپ
لیڈر تھے۔ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ اور دوسرے سیکنڈ لیفٹیننٹ
محمد شیر خان خاکوانی۔ وہ ابھی ابھی اکیڈمی سے آئے تھے جنہیں جنگ تو درکنار
جنگی مشق کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ البتہ جذبہ ایسا تھا کہ یہ لڑکے کفار کے سیاہ ہاتھیوں
کی آہنی دیواروں سے ٹکرا گئے اور دشمن کے آہنی غرور اور آتشیں فخر کو خاک
و خون میں ملا دیا۔

رجمنٹ کے سیکنڈ اِن کمان میجر امان اللہ ان کے ساتھ رہے اور
سیکٹر کے اس گوشے کو خاص طور پر اپنی نظر اور نگرانی میں رکھا۔

سوار محمد حسین، سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ کے ٹروپ سے وابستہ
تھا لیکن وہ ٹینک میں نہیں تھا بلکہ ڈاج کا ڈرائیور تھا۔ یاد رکھئے کہ پیادہ فوج
کے جوان کو سپاہی اور ٹینک رجمنٹ کے جوان کو سوار کہتے ہیں۔ سوار کہنے کی وجہ یہ ہے
کہ پہلے فوج میں گھوڑے ہوا کرتے تھے جنہیں رسالہ کہا جاتا تھا۔ پھر بکتر بند گاڑیاں آ
گئیں اور فوراً ہی ٹینک تیار کر لیے گئے۔ چنانچہ گھوڑوں کی جگہ ٹینک استعمال ہونے
لگے۔ اب بھی ٹینک رجمنٹ کو رسالہ کہا جاتا ہے اس کے جوان سوار کہلاتے
ہیں۔

سوار محمد حسین رجمنٹ میں ڈرائیور تھا لیکن ٹینک چلانے کی بجائے
گاڑی چلاتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ٹینک رجمنٹ کے ساتھ جو رائفل ٹروپ
(پیادہ دستے) ہوتے ہیں، انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے اور انہیں
ایمونیشن وغیرہ بھی پہنچاتا رہے۔ جب ٹینک آگے لڑتے ہیں تو ان کے ساتھ
دستوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس دستے کے پاس دیگر چھوٹے ہتھیاروں کے
علاوہ مشین گنیں اور ٹینک شکن آر آر گنیں (جیپوں پر نصب) ہوتی ہیں۔ ٹینکوں کی
حرکت کے ساتھ پیادہ جوانوں کو بھی نقل و حرکت کرنی پڑتی ہے جو گاڑیوں کے ذریعے
کی جاتی ہے۔

سوار محمد حسین ایسی ہی ایک گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رائفل ٹروپ

کو ایک پوزیشن تک پہنچا کر وہ خود اس وقت تک اپنی گاڑی کو کہیں چھپا کر
اس کے پاس بے کار بیٹھا رہے گا جب تک کہ اسے انہی جوانوں کو کسی اور جگہ
لے جانے کا حکم نہ ملے۔ سوار محمد حسین کو ایسی ڈیوٹی بالکل پسند نہیں تھی جس میں وہ
ایسے وقت اپنی گاڑی کے پاس چھپ کر بیٹھا رہے جب اس کے ساتھی لڑ اور
کٹ رہے ہوں۔ اُس نے اپنے افسروں سے کہا کہ اسے یا تو ٹینک میں بھیجا
جائے یا اسے اجازت دی جائے کہ رائفل ٹروپ کو پوزیشن تک پہنچا کر
وہ خود بھی ان کے دوش بدوش لڑے۔ پھر حکم ملنے پر وہ اس دستے کو اپنی گاڑی پر
ادھر اُدھر لے جائے یا انہیں ایمونیشن وغیرہ بھی پہنچائے۔

روسی ٹینکوں کا فخر توڑ دیا گیا

وہ اُن انسانوں میں سے تھا جو فطری طور پر سپاہی ہوتے ہیں۔ محمد حسین
ڈیوٹی اور ڈسپلن کا سخت پابند تھا۔ ہنس مکھ، صاف گو اور بلا جھجک بات کہہ گزرنے
والا۔ خود اعتمادی اتنی کہ افسروں کے ساتھ بھی کھل کر بات کرتا تھا۔ ایسی عادتوں
اور صلاحیتوں کی بدولت وہ افسروں میں مقبول تھا۔ اُس نے جب اپنی ڈیوٹی
کے ساتھ ساتھ لڑنے کی بھی ضد کی تو اسے ایک مشین گن دے دی گئی۔ اس طرح
اس نے اپنے فرائض میں اضافہ کر لیا۔ وہ دبلے پتلے جسم کا نوجوان تھا۔ دماغی لحاظ
سے تو بہت ہوشیار اور ذہین تھا لیکن جسم کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسی غیر
معمولی شجاعت کا مظاہرہ کر سکے گا جو اسے ایک زندہ روایت بنا دے گی۔

میجر محمد اکرم کے سکواڈرن کی پوزیشن پر دشمن نے ۵/۶ دسمبر کی درمیانی رات
کو آٹھ بجے حملہ کیا۔ حملے سے پہلے دشمن کے توپ خانے نے تین گھنٹوں تک
اولوں کی طرح گولے برسائے۔ یہ حملہ روس کے ٹی ۵۵ ٹینکوں کی پوری رجمنٹ
اور انفنٹری سے کیا گیا تھا۔ رات بھر ٹینکوں کا شدید معرکہ لڑا گیا۔ بے تحاشہ دباؤ کے
باوجود دشمن کو آگے نہ بڑھنے دیا گیا۔ صبح کے وقت دشمن کی تباہی دیکھی گئی۔ ہر
طرف اس کی انفنٹری کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور چار تباہ شدہ ٹینک نظر آ رہے

تھے۔ اس تمام نزرجمنٹ نے پہلے ہی تصادم میں دشمن کے بتیس ٹینک تباہ
کیئے تھے۔

یہ سکواڈرن گجگال کے علاقے میں آ گیا۔ اس کے سامنے بارودی سرنگیں
نہیں تھیں اسس لیے یہ ایک نازک علاقہ تھا۔ دشمن اسی علاقے پر حملے کر رہا تھا۔
اس کے حملے دو گاؤں —— ہرڑ کلاں اور ہرڑ خورد کے درمیان سے آتے تھے۔
محمد حسین، سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ کے ٹروپ کے ساتھ رائفل ٹروپ
میں تھا۔ اب اس کے پاس مشین گن بھی تھی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست کو سکواڈرن
کمانڈر میجر محمد اکرم نے چھ آر آر گنیں بھی دے دی تھیں جنہیں شام کے بعد
موزوں پوزیشنوں پر لگا دیا گیا۔

دشمن کا انداز یہ تھا کہ اس کا توپ خانہ بے تحاشہ گولہ باری کرتا رہتا تھا
اسس کے پاس گولوں کی کمی نہیں تھی نہ توپوں کی کمی تھی۔ وہ چھیشٹہ کور کے توپ خانے
کی گولا باری کرتا تھا جس کی توپوں کی تعداد چار سو سے کم نہیں ہو سکتی۔ یہ بلا مبالغہ
ژالہ باری کی طرح کی گولا باری ہوتی تھی جس سے زمین کا چپہ چپہ شعلے اگلتا تھا۔
میں پھٹتے گولوں کے لال انگارہ ٹکڑے اور پتھر اڑتے تھے۔ ٹینکوں یا مورچوں
سے نکل کر چلنا، رینگنا، بیٹھنا یا کھڑے ہونا خودکشی کے برابر تھا۔

ایسی شدید گولا باری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ جانی نقصان
ہو۔ اسس کا دراصل نقصان وہ یہ اثر ہوتا ہے کہ مسلسل دھماکوں اور گولوں کے
اڑتے ٹکڑوں اور پتھروں کی چیخوں اور زناٹوں سے اس علاقے میں مورچہ
انسانوں کے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔ مزاج میں اتنی جھنجھلاہٹ پیدا ہو
ہے کہ انسان پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ موت کا خوف ہر لمحہ
پر طاری رہتا ہے۔ اعصابی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور کئی جوان پاگل ہو جا
ہیں جسے SHELL SHOCK کہتے ہیں۔ اسس کے علاوہ کوئی حرکت مم
نہیں ہوتی۔ گولوں کی زد میں آنے کے علاوہ گرد و غبار کا یہ عالم ہوتا ہے کہ
تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اس گرد و غبار میں دشمن کے ٹینک یا پیادہ دستے یا دونو
حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ گولا باری کے مسلسل دھماکوں سے مورچوں میں

ہوئے جوان حملہ روکنے کے قابل نہیں ہوتے۔

پاک فوج کے افسروں اور جوانوں کی یہ قوت بلا مبالغہ مافوق الفطرت
ہے کہ وہ کئی کئی گھنٹے متواتر گولا باری سہہ لیتے ہیں۔ یہ اعصاب کی غیر معمولی مضبوطی
کا ثبوت ہے۔ ایسی مضبوطی ایمان کی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

ہم لاشوں کو سنگینوں پر اٹھائیں گے

ایسی ہی گولا باری جاری تھی اور رات گہری ہو رہی تھی۔ رات کے نو بج
رہے تھے۔ سوار محمد حسین اپنے ٹروپ لیڈر سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ
کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے ٹروپ لیڈر کو بتایا کہ دشمن کے ٹینک روشنی کر رہے
ہیں۔ روشنی کی جلتی بجھتی چمک سے پتہ چلتا تھا کہ حملہ آ رہا ہے۔ محمد حسین اس
شیلنگ میں آگے چلا گیا اور بلند جگہ کھڑے ہو کر دشمن کو گالیاں دے کر للکارنے
لگا —— "آگے آؤ، ہندوؤ آگے آؤ" —— آج کے دور کی جنگ میں جہاں
توپیں اور ٹینک گولے برسا رہے ہیں، محمد حسین کا یہ انداز بے معنی سا لگتا
ہے لیکن اُس کا یہ انداز بتاتا تھا کہ اس کے دل میں اپنے وطن کی کتنی محبت
اور دشمن کے خلاف کتنی نفرت تھی۔

اسس پوزیشن کے سامنے نشیب تھا۔ دشمن نے انفنٹری سے
حملہ کیا۔ اس کے ٹینک پیچھے کھڑے گولا باری سے انفنٹری کو مدد دے رہے
تھے۔ انفنٹری ہمارے مورچوں کے قریب پہنچ گئی۔ اپنے توپ خانے کے
او پی کیپٹن امین مرزا کسی اور جگہ تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست توپ خانے
کی گولا باری سے دشمن کو روکنا چاہتے تھے، مگر کسی وجہ سے ان کے ساتھ رابطہ
قائم نہ ہو سکا۔ ایسے موقع پر جب دشمن کے توپ خانے کے ساتھ ٹینکوں کی
گولا باری بھی شامل ہو گئی تھی، سوار محمد حسین او پی کے پاس دوڑ گیا اور کیپٹن امین مرزا
کو آگے بلا لایا۔ انہوں نے آتے ہی صورتِ حال دیکھی اور اپنے توپخانے کی گولا باری
شروع کرائی۔

دشمن جو بہت قریب آگیا تھا اپنے خون میں نہانے لگا۔ یہ جنگ دو گھنٹے جاری رہی اور دشمن کا حملہ ناکام ہوگیا۔ دشمن کی گولا باری رک گئی تھی۔ حملے کی ناکامی کے بعد پھر گولے برسنے لگے۔ ایسی گولا باری کا مقصد اکثر یہ ہوتا ہے کہ دشمن لاشیں اٹھا رہا ہے۔ محمد حسین نے سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست سے کہا کہ دشمن گولا باری کی آڑ میں لاشیں اٹھا رہا ہے۔ ہمیں اجازت دیں کہ کافروں کی چند ایک لاشیں ہم اٹھا لائیں۔ اس سے پوچھا گیا کہ ہم کافروں کی لاشوں کو کیا کریں گے۔ اس نے جواب دیا ——— "رائفلوں سے لگی ہوئی سنگینوں پر ان لاشوں کو اٹھا کر دشمن کو دکھائیں گے۔"

۷ دسمبر کے روز ایک گاؤں گدر پور کے متعلق شک پیدا ہوگیا کہ وہاں دشمن ہے۔ یہ گاؤں بلندی پر تھا جو اپنے مورچوں کے لیے خطرہ تھا۔ اس گاؤں کو دیکھنے کے لیے ایک گشتی پارٹی بھیجی گئی۔ یہ کام بھی محمد حسین نے اپنے ذمے لیا جو اس لیے بے حد خطرناک تھا کہ اگر گاؤں میں دشمن مورچہ بند ہوا تو قریب آنے والے کسی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ محمد حسین کے ساتھ تین اور جوان بھیجے گئے ——— سوار میر عالم، اے، ایل، ڈی ظہور اور اے ایل ڈی شبیر ——— دن کے دس بج رہے تھے۔ یہ چاروں جوان رینگتے سرکتے گاؤں گدر پور تک پہنچ گئے۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست کو وہاں سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تو صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے خود چلے گئے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہ چار جوان دشمن کے جال میں نہ پھنس گئے ہوں لیکن وہاں انہیں کچھ اور ہی نظر آیا۔ گاؤں محمد حسین اور اس کے تین ساتھیوں کے قبضے میں تھا۔ گاؤں میں دشمن کی تھوڑی سی نفری تھی جسے ہمارے چار جوان بھگا چکے تھے اور اب وہ گاؤں سے آگے جاکر دشمن پر فائرنگ کر رہے تھے ——— اور محمد حسین اٹھ اٹھ کر دشمن کو گالیاں دے رہا تھا۔ ان چاروں کو محمد حسین کی زیرِ کمان وہیں رکھا گیا تاکہ وہاں دشمن نہ آسکے۔ میدانِ جنگ میں بلندی پر واقع گاؤں جنگی برتری کے حامل ہوتے ہیں اس لیے اس گاؤں کو قبضے میں رکھنا ضروری تھا۔

محمد حسین نے اس گاؤں سے دشمن پر نظر رکھی۔ وہ دوڑتا ہوا پیچھے آیا اور اطلاع دی کہ کھیڑا گاؤں کی طرف سے دشمن کے ٹینک گجگال کی طرف آرہے ہیں۔ اس بروقت اطلاع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آر آر گنیں سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد بشیر خان خاکوانی کی کمان میں اگلے دونوں گاؤں ہرڑ کلاں اور ہرڑ خورد بھیج دی گئیں جہاں انہیں ڈھکی چھپی پوزیشنوں میں لگا دیا گیا۔ دشمن اس راستے سے حملہ کرکے پیچھے ہٹ چکا تھا اس لیے اس علاقے سے واقف تھا۔ اس کے ٹینک اب اس خوش فہمی میں بڑھے آرہے تھے کہ راستہ پہلے کی طرح صاف ہوگا۔ چونکہ اس علاقے میں بارودی سرنگیں نہیں بچھائی گئی تھیں، اس لیے وہ ہمارے دفاعی مورچوں کے اسی شگاف سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دشمن کا پہلا ٹینک گاؤں سے دو سو گز تک آگیا تو دفعدار سیف الرحمٰن نے آر آر گن کا پہلا گولا فائر کرکے دشمن کی ٹینک رجمنٹ کا استقبال کیا۔ گولا ٹھکانے پر لگا اور ٹینک جو روس سے اچھا بھلا ہندوستان میں آیا تھا، نارووال کی سرحد پر آکر مہیب شعلہ بن گیا اور اپنے کریو سمیت بھسم ہوگیا۔ ایک ہی گولے نے دشمن کی خوش فہمی دور کردی۔ اس کے ٹینک تیزی سے دائیں، بائیں اور پیچھے کو بکھرنے لگے۔ وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں درختوں، فصلوں، بلند جگہوں وغیرہ کی آڑ بہت تھی۔ ٹینک بکھر کر چھپ گئے۔

صورتِ حال سنگین تھی

میدانِ جنگ کی صورتِ حال یہ تھی کہ دشمن کا توپ خانہ حسبِ معمول بے پناہ گولا باری کر رہا تھا جس کے جواب میں ہمارا توپ خانہ بھی گولے برسا رہا تھا۔ اس گرد و غبار میں اور دشمن کو اچھی آڑ مل جانے کی وجہ سے دشمن کے ٹینکوں کو دیکھنا ممکن نہ رہا۔ ایسی قیامت میں پاک فوج کا ایک جوان اپنی جان کو یقینی موت کے خطرے میں ڈال کر آگے جاکر دائیں بائیں بھاگ دوڑ کر دشمن کے

ٹینکوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی جرأت مندی اور محنت رائیگاں نہ گئی۔ لیے
چھپے ہوئے ٹینک نظر آنے لگے ـــــــ یہ جوان سوار محمد حسین تھا۔

اُس نے ایک ٹینک کو دیکھا تو اس آر آر گن کی طرف بھاگا جو اس ٹینک کو آسانی
سے زد میں لے سکتی تھی۔ اس نے گن والوں کو اس ٹینک کا محل وقوع بتا کر گولا فائر
کرایا اور ٹینک کو تباہ کرا دیا۔ وہ پھر آگے دوڑ پڑا۔ اتنے میں دشمن کے طیارے آگئے
جنہوں نے ہمارے مورچوں پر بمباری بھی کی، راکٹ اور مشین گن فائرنگ بھی کی۔
محمد حسین اب توپوں کی گولا باری اور طیاروں کی فائرنگ میں دشمن کے ٹینکوں کو ڈھونڈ
رہا تھا۔ جوں ہی اسے کوئی ٹینک نظر آتا وہ کسی ایسی آر آر گن کی پوزیشن تک بھاگتا
ہُوا پہنچتا جو اس ٹینک کو زد میں لے سکتی تھی۔ آر آر گنیں بکھیر کر دُور دُور پوزیشن
میں رکھی گئی تھیں۔ ان کے توپچیوں کو دشمن کے ٹینک نظر نہیں آسکتے تھے۔
محمد حسین آگے جا جا کر ٹینکوں کو دیکھ رہا تھا اور آر آر گنوں کے توپچیوں کی راہنمائی
کر رہا تھا۔

طیاروں اور دشمن کے توپ خانے کی گولا باری کی وجہ سے صورتِ حال
خاصی سنگین ہو گئی تھی جس میں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دشمن کے ٹینک ایک
اور سمت سے حملے کی ترتیب میں جمع ہو رہے تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست
علی شاہ نے سکواڈرن کمانڈر میجر محمد اکرم کو اس صورتِ حال سے آگاہ
کیا۔ میجر محمد اکرم نے ان کی مدد کے لیے ٹینکوں کا ایک ٹروپ بھیج دیا جس
کے ٹروپ لیڈر نائب رسالدار دوران جان تھے (ایک ٹروپ میں تین یا
چار ٹینک ہوتے ہیں۔ تعداد کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے) اس ٹروپ کے ٹینکوں
کو آر آر گنوں کی لائن میں موزوں جگہوں پر پوزیشن میں کھڑا کر دیا گیا، لے، ایل،
ڈی محمد علی کو آگے بھیج کر سوار محمد حسین، سوار میر عالم، لے ایل ڈی ظہور اور
اے ایل ڈی شبیر کو گندپور گاؤں سے واپس بلا لیا گیا۔

دشمن کا یہ حملہ روک لیا گیا۔ میجر محمد اکرم نے آگے جا کر صورتِ حال
کا جائزہ لیا تو اسی گشتی پارٹی کو پھر آگے بھیج دیا تاکہ حملے کی اطلاع قبل از وقت
مل جائے۔ اس دوران پاک فضائیہ کے طیارے آگئے۔ خاصی دیر سارے محاذ

پر اڑ کر پھاٹکوٹ کی سمت چلے گئے۔

شام چھ بجے محمد حسین دوڑتا ہُوا آیا اور اطلاع دی کہ دشمن گندپور اور
کھیڑا کے درمیانی علاقے میں ٹینکوں اور انفنٹری کو جمع کر رہا ہے۔ اس
قبل از وقت اطلاع سے حملہ روکنے کی تیاری کر لی گئی۔ وہاں اپنے ٹینکوں کے
صرف دو ٹروپ، چھ آر آر گنیں اور مختصر سا ایک رائفل ٹروپ تھا۔ اسی قلیل تعداد
سے پوری ٹینک رجمنٹ اور ایک پلٹن کا حملہ روکنا تھا۔ حملہ آوروں کی قوت
اس سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی، مگر اپنے پاس یہی چند ایک دقیانوسی شرمن ٹینک
اور چھ آر آر گنیں تھیں جن سے چار ہزار گز یعنی اڑھائی میل کے قریب علاقے
کا دفاع کرنا تھا۔

شام ساڑھے چھ بجے اپنے جوانوں کے لیے ایک گاڑی میں کھانا آیا
جو ابھی تقسیم ہو ہی رہا تھا کہ دشمن کی سینکڑوں توپوں نے آگ اور لوہے
کی بارش شروع کر دی۔ دشمن گولا باری کے معاملے میں بڑا ہی شاہ خرچ
واقع ہُوا ہے۔ صحیح معنوں میں گولوں کا مینہ برسا دیتا ہے۔ یہ شدید
گولا باری حملے کا پیش خیمہ تھا۔ دور گاؤں میں روشنی نظر آئی۔ بہت
بلند شعلے اٹھ رہے تھے۔ غالباً ہمارے توپ خانے کی گولا باری سے بھوسے
کے بہت بڑے ڈھیر کو آگ لگ گئی تھی۔ تاریک رات میں یہ روشنی ہمارے
لیے فائدہ مند تھی۔ دشمن کی حرکت صاف نظر آ رہی تھی۔

دشمن عقب میں آگیا

گولا باری کی آڑ میں دشمن کی انفنٹری نے "جے ہند" کا نعرہ لگا کر حملہ کیا۔
دشمن کے ٹینک پیچھے کھڑے ہماری پوزیشنوں پر گولا باری کر رہے تھے۔ بھارتیوں
نے جرأت مندی کا قابلِ تعریف مظاہرہ کیا۔ وہ ہمارے ٹینکوں کے عقب میں
آگئے۔ ٹینکوں کی مشین گنیں فائر کر رہی تھیں اور رائفل ٹروپ جم کر مقابلہ کر رہا
تھا مگر یہ تقریباً دست بدست جنگ تھی۔ اپنے پرائے کی پہچان ختم ہو گئی۔ گرینیڈ

پھینکے جا رہے تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر خاکوانی کا ملاپ اپنے ٹینکوں سے
ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اس قیامت میں اپنے ٹینک سواروں کو پکار رہے تھے۔

دشمن زیادہ دیر جم نہ سکا اور بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد محمد حسین نے
بتایا کہ اپنے کچھ آدمی ہرڑ کلاں میں رہ گئے ہیں۔ ان کا گھیرے میں آجانا لازمی تھا۔
اپنے رائفل ٹروپ کو ان کی مدد کے لیئے تیار کیا گیا لیکن نصف گھنٹہ بعد دشمن
بالکل ہی بھاگ گیا۔

۸ دسمبر دوپہر کے وقت دشمن کے ٹینک ایک اور حملے کے لیے آئے۔
ہمارے ٹینک ڈھکے چھپے تھے۔ دشمن کے ٹینک اس خوش فہمی میں بڑھتے
آئے کہ پاکستانی ٹینک وہاں نہیں ہیں۔ ہمارے ٹینک وہیں تھے اور
انہوں نے فائر روک رکھا تھا تاکہ دشمن کے ٹینک پوری طرح زد میں آجائیں۔ جوں
ہی پہلا ٹروپ قریب آیا، ہمارے ٹینکوں نے گولے داغ دیئے۔ تین ٹینک جل
اٹھے اور باقی رک گئے۔

سوار محمد حسین اپنے ساتھیوں، شبیر اور ظہور کو ساتھ لے کر ہرڑ کلاں گاؤں
میں جا پہنچا اور سب سے اونچے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر دشمن کو دیکھنے لگا۔
دشمن ذرا دور ایک باغیچے میں ٹینکوں اور انفنٹری کو اکٹھا کر رہا تھا۔ محمد حسین نے وہاں سے
بلند آواز سے پکار پکار کر کہا کہ توپ خانے کا فائر کراؤ۔ توپ خانے کے او پی کیپٹن
امین مرزا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ گاؤں میں جا کر اسی چھت پر چڑھ
گئے۔ وہاں سے انہوں نے اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیا۔ پیچھے سے جب
گولے آ کر باغیچے میں گرے تو دشمن کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گولے
نہایت صحیح جگہ پر گر رہے تھے۔ دشمن افراتفری کے عالم میں منتشر ہونے لگا اور اس
کے جو ٹینک دائیں بائیں کھڑے تھے، انہوں نے اندھا دھند گولا باری شروع
کر دی۔

دشمن کی اس گولا باری سے چھت پر کھڑے رہنا بے حد خطرناک تھا۔
کیپٹن امین مرزا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ وہاں سے اتر آئے
لیکن سوار محمد حسین نے وہاں سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ جب تک دشمن

پوری طرح تباہ یا پسپا نہیں ہو جاتا، اس جگہ سے نہیں ہٹوں گا ——— آخر
دشمن تباہ بھی ہوا اور بھاگ بھی گیا۔

دن کے دو بجے دشمن کے طیارے آ گئے اور ان کے ساتھ توپ خانے
کے فضائی او پی کا چھوٹا طیارہ ایل ۱۹ بھی آ گیا۔ اس نے ہماری پوزیشنوں پر بہت
گولا باری کرائی اور اس کے ساتھ طیاروں نے بھی خوب آگ برسائی۔ اس
سے ہماری دو آر آر گنوں کی جیپوں کو آگ لگ گئی جس میں دو جوان شہید ہو گئے۔
لیکن پوزیشن کسی نے نہیں چھوڑی ——— یہ اپنے دستوں کی پہلی شہادت تھی۔
اُس وقت تک دشمن کی سینکڑوں پیادہ اور بکتر بند نفری تباہ کی جا چکی تھی۔

دشمن کے او پی کی تلاش

توپوں اور طیاروں کی اس قیامت میں سوار محمد حسین اسی چھت پر
کھڑا دشمن کے ٹینکوں اور پیادہ دستوں پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ کسی طرف سے
ٹینک یا انفنٹری آگے بڑھے تو قبل از وقت اطلاع دے دے۔ یہ بے حد خطرناک
ڈیوٹی تھی جو اس نے رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے لگا رکھی تھی۔ جب دشمن
کے طیارے چلے گئے اور گولا باری بھی ختم ہو گئی تو محمد حسین واپس آ گیا۔ اس
نے بتایا کہ دور دور تک دشمن نظر نہیں آ رہا۔ اس نے اپنے جائزے اور مشاہدے
کے مطابق مشورہ دیا کہ اپنے ٹینکوں، آر آر گنوں اور رائفل ٹروپ کو اور آگے کر لیا
جاتے۔ وہ موزوں پوزیشنیں دیکھ آیا تھا۔ ایسے مشورے ایک سپاہی کی فہم و
فراست اور فرائض سے بالا ہوتے ہیں لیکن سوار محمد حسین غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ
کر رہا تھا۔

اگلے روز یعنی ۹ دسمبر کو مورچے آگے کر لیے گئے اور فوراً ہی مورچوں پر بے تحاشہ
گولا باری شروع ہو گئی جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن کا کوئی او پی کہیں قریب
ہے یا ایسی جگہ پر چھپا ہوا ہے جہاں سے وہ سارے علاقے کو دیکھ رہا ہے۔ سیکنڈ
لیفٹیننٹ فراست علی شاہ نے سامنے کا علاقہ تلاش کرنے کو کہا۔ یہ فرض بھی محمد حسین

نے اپنے ذمے لے لیا۔ ایسی بے پناہ گولا باری میں وہ خطرناک حد تک آگے چلا
گیا۔ کہیں رینگ کر اور کہیں اٹھ کر وہ ایسے علاقے کو کھوجنے لگا جہاں دشمن کی
ایک گولی اُسے ختم کر سکتی تھی۔ اس کی عقابی نگاہیں ہر اُس درخت کے پتے
پتے کو دیکھ رہی تھیں جو اسے قریب یا دُور کھڑا نظر آتا تھا۔

دو گھنٹوں کی صبر آزما تلاش کے بعد محمد حسین نے ایک جگہ سے ایک
درخت کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے کہا:

"فائر.... فائر" —— سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست او پی کو زندہ پکڑنے
کا بندوبست کرنے لگے۔ لیکن محمد حسین نے غالباً یہ سوچ کر کہ او پی اتنے قریب
جانے والوں پر فائر نہ کر دے، بار بار کہا —— "فائر.... فائر" —— چنانچہ ایک
ٹینک کی بڑی گن بھی اور مشین گن بھی اس درخت پر فائر کی گئی جس سے درخت ہی
اڑ گیا۔ موٹے موٹے ٹہن ٹوٹ ٹوٹ کر گرے اور دشمن کے او پی کے پرخچے اُڑا
دیئے گئے۔ اس سے دشمن کا توپخانہ اندھا ہو گیا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست، محمد حسین کی بے خوفی اور فرض کی لگن سے
اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ انہوں نے سکواڈرن کمانڈر میجر محمد اکرم سے سفارش
کی کہ محمد حسین کو تمغۂ جرأت ملنا چاہیئے۔ میجر اکرم اس وقت آگے ہی تھے۔
یہ سفارش محمد حسین کا جائز حق تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد حسین، اس کے
تمام تر ساتھی اور افسر تمغوں کی خاطر نہیں لڑ رہے تھے لیکن ٹروپ لیڈر اور سکواڈرن
کمانڈر، محمد حسین کے جذبۂ ایثار اور رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو موت کو خطرے
میں ڈالنے کی غیر معمولی جرأت کو نظر انداز نہ کر سکے۔

دشمن اسی علاقے پر ٹینکوں اور پیادہ دستوں سے تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔
اس کا ہر حملہ کم از کم ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک بٹالین سے ہوتا تھا۔ ہر بار اُس
کی رجمنٹیں تازہ دم ہوتی تھیں کیونکہ اس کے پاس نفری اور قوت کی کمی نہیں تھی۔
اس کے مقابلے میں ہماری پہلے روز والی مختصر سی نفری لڑ رہی تھی۔ اس میں سے
دو آر آر گنیں تباہ بھی ہو چکی تھیں۔

شاہباز نے رُوس کا فخر توڑ دیا

دشمن اس علاقے کو ہر قیمت پر لینا چاہتا تھا مگر زیادہ سے زیادہ قوت
سے حملہ کر کے بھی اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ پاکستان
کے جیالوں نے اسے کمر توڑ نقصان پہنچایا تھا۔ اب اُس نے طیارے بُلا لیے
جنہوں نے ہماری پوزیشنوں پر راکٹ اور مشین گن فائرنگ شروع کر دی۔
اس کے ساتھ دشمن کی کور آرٹلری کی گولا باری آنے لگی۔ اپنے مورچے گرد و غبار میں
رُوپوش ہو گئے اور صورتِ حال ایسی بھیانک ہو گئی جس میں جوانوں کو ہوش
ٹھکانے رکھنا اور زندہ رہنا ناممکن نظر آنے لگا۔ ایسی صورت میں جب
زمین و آسمان گرد و غبار میں ایک ہو جاتے ہیں اور گولے اولوں کی طرح پڑ رہے
ہوتے ہیں، دشمن کے ٹینک اور پیادہ دستے مورچے پر چڑھ آتے ہیں۔ ایسی
قیامت خیزی میں محمد حسین گرد و غبار کی گھٹاؤں میں بھاگ دوڑ کر دیکھ رہا تھا کہ
کسی طرف سے دشمن کے ٹینک تو نہیں آرہے۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ اور سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد بشیر خاکوانی کے لیے
جنگ کا انتہائی سنگین خطرہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے سکواڈرن کمانڈر میجر اکرم
سے ملاپ کر کے کہا کہ پاک فضائیہ کے بغیر یہ طوفان روکنا مشکل ہے۔
میجر محمد اکرم اور میجر امان اللہ نے ان نوجوان ٹروپ لیڈروں کا حوصلہ بڑھایا
اور کہا کہ پاک فضائیہ آرہی ہے۔

فضا میں روس کے چار جدید ترین لڑاکا بمبار طیارے SU 7 تھے جو ہماری
سرحدوں پر آگ برسا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں روس کے چار جدید ترین طیاروں
کے مقابلے کے لیے پاکستان کے تین قدیم ترین سیبر طیارے آ گئے۔ اپنے
افسروں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایس یو، اور سیبر میں وہی فرق
ہوتا ہے جو موٹر سائیکل اور بائیسکل میں ہوتا ہے۔ بھارتی بھی ہمارے سیبر طیاروں
کو دیکھ کر طنزیہ مسکرائے ہوں گے کہ پاکستانیوں نے روسی طیاروں کے مقابلے میں
بھیجا کیا ہے۔ مگر فضا میں ایک معجزہ رونما ہُوا۔ ہمارے ایک شاہباز نے

چند سیکنڈ میں ایک روسی طیارے کو آگے لگا لیا۔ مشین گنیں فائر کیں اور روس
کا تیز ترین اور جدید ترین طیارہ سیاہ دھواں اگلتا زمین پر جا پڑا اور جل کر راکھ ہو گیا۔
اپنے افسر بتاتے ہیں کہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں کی اڑان میں نرالی
شان اور ان کے جھپٹوں اور فضائی پینتروں میں خود اعتمادی تھی۔ ایک روسی طیارے
کو گرا کر انہوں نے دشمن کے دو ٹینک بھی تباہ کر دیئے اور جب اوپر دیکھا تو
فضا میں کوئی ایس یو، نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ہمارے تینوں شاہباز نہایت
خوبصورت ترتیب میں دشمن کے ٹینکوں پر اور عقب میں غوطے میں جا اور اٹھ
رہے تھے۔ محاذ اچانک خاموش ہو گیا۔ شاہبازوں نے اپنے مورچوں پر الوداعی
غوطہ لگایا اور جس شان سے آئے تھے اسی شان سے چلے گئے۔

جوان مورچوں سے نکل آئے اور "پاکستان ایئر فورس زندہ باد" کے
نعرے لگانے لگے۔ سوار ٹینکوں پر کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور جوانوں
نے ناچنا شروع کر دیا۔ اس مسرت بھرے فاتحانہ ہنگامے میں محمد حسین
کی آواز سب سے بلند تھی۔ اس نے سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست کے پاس
جا کر انہیں سکھوں اور ہندوؤں کے لطیفے سنانے شروع کر دیئے۔ اس وقت
اس کے سر پر فولادی خود (ہیلمیٹ) نہیں تھا۔ موت کی آغوش میں ہنسی
مذاق عجیب سا لگتا ہے لیکن محمد حسین دشمن اور موت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ
فراست نے اسے کہا ——— "خدا کے بندے! یہ ہنسنے ہنسانے کا وقت نہیں۔
اور تم ہیلمیٹ پہن لو۔ گولے کا ٹکڑا ننگے سر پر لگا تو کھوپڑی کھل جائے گی۔"

"سر!" —— اس نے اپنی مخصوص اور فطری شگفتگی سے جواب دیا ——— "مارنے
اور مرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوا ہوں۔ مار رہا ہوں۔ جب مرنے کا وقت
آیا تو اسی طرح ہنستے ہوئے مروں گا" ——— اور وہ ہنستا کھیلتا اپنے مورچوں کی
طرف چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ چائے بنانے لگا اور اس کے ساتھ ہی دشمن
کا توپخانہ پھر پھٹ پڑا جیسے ساون کی گھٹا پھٹ پڑی ہو۔ اس شدید اور
تیز گولہ باری میں محمد حسین چائے کا کپ اٹھائے سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست کے پاس
گیا۔ وہ ایسی صورت حال میں چائے پینے کے موڈ میں نہیں تھے لیکن محمد حسین نے

انہیں چائے پینے پر مجبور کر دیا۔

رات کے وقت محسوس ہوا کہ دشمن ہرڑ خورد میں آ گیا ہے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ
بشیر خاکوانی کی قیادت میں دس جوانوں کو وہاں بھیجا گیا۔ محمد حسین اس پارٹی کے ساتھ
تھا۔ وہ تو اب سب کا گائیڈ بن گیا تھا۔ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس
کا ارادہ تھا کہ اگر وہاں دشمن ہوا تو زندہ پکڑ کر لائیں گے مگر گاؤں خالی تھا اور اس
پارٹی کو وہیں رہنے کا حکم دیا گیا۔ ذرا دیر بعد انجینیئرز کو آگے بھیج دیا گیا تا کہ اس
علاقے کے آگے بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ یہ کام بھی محمد حسین کی راہنمائی میں ہوا
کیونکہ وہ علاقے سے اور دشمن کے حملوں کے راستوں سے اچھی طرح واقف
ہو چکا تھا۔

"جے ہند" اور بارودی سرنگیں

دو گھنٹوں میں تمام علاقے کے سامنے بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں اور
رات بارہ بجے سیکنڈ لیفٹیننٹ بشیر خاکوانی اپنی پارٹی کو واپس مورچوں میں
لے آئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد دشمن نے حسب معمول گولہ باری کے ساتھ انفنٹری
سے حملہ کر دیا۔ ٹینک پیچھے کھڑے گولہ باری کر رہے تھے۔ دشمن کو معلوم
تھا کہ یہ علاقہ بارودی سرنگوں سے صاف ہے چنانچہ "جے ہند" کے نعرے
بے خوف و خطر بڑھتے آئے اور جب بارودی سرنگوں میں داخل ہوئے تو زمین
نے دھماکے اور شعلے اگل کر "جے ہند" کے نعروں کو ہڑپ کر لیا۔ ادھر سے
ٹینکوں اور رائفل ٹروپ کی مشین گنوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ تصور
کیا جا سکتا ہے کہ دشمن کا نقصان کس قدر ہوا ہو گا۔ جو بھارتی بارودی سرنگوں سے
بچے وہ مشین گنوں کی نذر ہو گئے۔

دشمن اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا کہ رات بھر ہماری پوزیشنوں
پر بے دریغ گولہ باری کرتا رہا۔

۱۰ اردسمبر کی تاریک صبح طلوع ہوئی۔ سورج اُفق سے نکلا تو ضرور ہوگا مگر میدانِ جنگ کے غبار کے پیچھے نظر نہ آیا۔ نو بج رہے تھے جب دشمن کی گولا باری نے حشر برپا کردیا۔ حشر کا لفظ مبالغہ آرائی نہیں۔ دشمن نے توپخانے اور آرمر کی تمام ترگنوں کے شدید اور تیز فائر کو اس ذرا سے علاقے پر مرکوز کردیا تھا جہاں ہمارے مٹھی بھر دقیانوسی ٹینکوں اور ان چند ایک جوانوں نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ اس کے روسی ٹینک بھی ان چند ایک پاکستانیوں کے پاؤں نہیں اکھاڑ سکے تھے اور روس کے ایس یو۔ طیارے بھی ناکام ہو گئے تھے۔ اب وہ توپوں کی مدد سے کچھ زمین حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے ٹینک سامنے والے ایک گاؤں ہرڑ کلاں کے قریب اکٹھے ہونے لگے اور دشمن کی انفنٹری نے دوسرے گاؤں ہرڑ خورد کے مکانوں کی چھتوں پر مورچے قائم کر کے مشین گنیں فائر کرنی شروع کر دیں۔ ہمارے ٹینکوں نے چھوٹی بڑی گنوں سے اور رائفل ٹروپ نے بھی مشین گنوں اور دیگر ہتھیاروں سے فائرنگ شروع کر دی۔

محمد حسین اپنے ٹروپس کی آنکھ بن گیا

ایسے موقعے پر محمد حسین نے اپنے ذمے جو فرض عائد کر لیا وہ اس کی نارمل ڈیوٹی سے بالا تھا۔ گولا باری سے لوہے کے ٹکڑے اور پتھر ہر سو اُڑ رہے تھے اور گولیوں نے فضا میں آگ کا جال تن دیا تھا۔ ذرا سی حرکت خودکشی کے برابر تھی۔ اپنی آر آر گنیں، ٹینک اور رائفل ٹروپ کی مشین گنیں دُور دُور پوزیشن میں تھیں کیونکہ ان کی ذمہ داری کا علاقہ زیادہ تھا۔ محمد حسین اڑتی گولیوں اور گولوں کے ٹکڑوں میں دَوڑ دَوڑ کر آگے جاتا، دشمن کے کسی چھپے ہوئے ٹینک یا کسی مشین گن کو دیکھتا اور دوڑتا ہوا اپنی کسی آر آر یا مشین گن کے پاس جا کر بتاتا کہ وہاں فائر کرو۔

اس کے ساتھ وہ ہر ایک مورچے میں جاتا، نعرے لگاتا، ہر کسی کا حوصلہ بڑھاتا اور ایمونیشن اس انداز سے مورچوں تک پہنچاتا کہ ایک بکس کندھے پر اور دوسرا بغل میں دباتے، اتنے زیادہ بوجھ تلے دوڑ کر مورچے میں رکھتا رہا۔ اس

دوران وہ اپنی مشین گن بھی جو اس کے مورچے میں پڑی تھی کسی ٹارگیٹ کو دیکھ کر اس پر فائر کرتا رہا۔

دشمن کے ٹینکوں کے چھپنے کی وہاں بہت جگہیں تھیں۔ اس کے علاوہ دونوں طرفوں کے توپخانوں کی گولا باری کی گرد اور دھوئیں میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ محمد حسین بہت آگے جا کر کسی چھپے ہوئے ٹینک کو دیکھتا۔ پھر یہ دیکھتا کہ اپنی کونسی پوزیشن کی آر آر گن یا ٹینک اسے مار سکتا ہے۔ وہ دوڑ کر اس تک پہنچتا اور دشمن کے ٹینک کی صحیح نشاندہی کر کے فائر کرواتا۔ آر آر اور ٹینکوں کے توپچی اپنے طور پر دشمن کے ٹینکوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب محمد حسین آگے پیچھے دوڑتا تھا تو ایسے لگتا تھا جیسے مشین گنوں کی گولیاں اس کے جسم سے پار ہو رہی ہیں، کیونکہ فضا کا کوئی ایک انچ حصہ بھی گولیوں سے محفوظ نہیں تھا لیکن گولیاں اس کے جسم سے نہیں بلکہ اس کا جسم گولیوں سے گزر رہا تھا۔ اور یہ اُسی دُبلے پتلے انسان کا کارنامہ تھا کہ دشمن کے ٹینک آگے بڑھنے کی بجائے ایک دوسرے کے پیچھے تباہ ہو رہے تھے۔ محمد حسین اپنے ٹروپس کی آنکھ بنا ہوا تھا۔

آر آر گن جب فائر کرتی ہے تو اس کے پیچھے سے شدید تیزی سے دُھواں اور شعلہ سا نکلتا ہے جسے بلاسٹ کہتے ہیں اس لیے فائر کرتے وقت گن کے پیچھے کوئی آدمی کھڑا نہیں رہنے دیا جاتا۔ ایک بار محمد حسین کسی آر آر کے توپچی کو گن کے پیچھے کھڑا بتا رہا تھا کہ فلاں درخت کے تنے کے ساتھ گولا فائر کرو۔ اس کے پیچھے ایک ٹینک کھڑا ہے۔ توپچی نے فوراً نشانہ لیا اور گولا فائر کر دیا۔ محمد حسین پر ایسی ہیجانی کیفیت طاری تھی کہ اس کی نظر دشمن کے ٹینک پر تھی اور وہ گن کے پیچھے کھڑا رہا لیکن ذرا سا ایک طرف تھا۔ جب گولا فائر ہوا تو بلاسٹ اس کے منہ پر پڑا مگر ذرا ایک طرف ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ ذرا جُھلس گیا۔ کوئی افسر دُور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اس کی طرف دوڑنے لگا تو محمد حسین نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ پھر آنکھوں پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہلایا اور اشاروں میں ہنس کر افسر کو بتا دیا کہ کان بند ہو گیا ہے لیکن آنکھیں ٹھیک ہیں، میرا کچھ نہیں بگڑا اور وہ پھر آگے کو دوڑ پڑا۔

رجمنٹ کے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر امان اللہ نے اسی وقت گھمسان کے

معرکے میں وائرلیس پر رجمنٹ کمانڈر کرنل طفیل محمد سے سفارش کی کہ وہ سوار محمد حسین کو پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز دینا چاہتے ہیں۔ توقع یہ تھی کہ محمد حسین نہ صرف پہلا سپاہی نشانِ حیدر ہوگا بلکہ پہلا زندہ نشانِ حیدر ہوگا۔ مگر محمد حسین کی زندگی صرف تیس منٹ رہ گئی تھی۔ محمد حسین کو علم نہیں تھا کہ اسے تمغہ دلانے کی سفارش ہو چکی ہے۔ وہ بے نیاز تھا۔

تیس منٹ بعد

محمد حسین دشمن کا کوئی چھپا ہُوا ٹینک دیکھ کر دوڑتا آیا اور ایک آر آر گن کے قریب کھڑا توپچی کو بتا رہا تھا۔ توپچی نے گولا فائر کیا۔ اُدھر سے ایک مشین گن برسٹ آیا۔ اُدھر دشمن کا ٹینک تباہ ہُوا اُدھر مشین گن کا برسٹ محمد حسین کے سینے سے پار ہو گیا اور وہ گر پڑا۔ نائب رسالدار علی نواب اور لانس دفعدار عبدالرحمٰن کیانی دوڑ کر پہنچے اور محمد حسین کو اٹھایا۔ محمد حسین نے نحیف آواز میں پوچھا ——— "دشمن کہاں ہے؟ آگے تو نہیں آیا؟" ——— اور اس نے جان اللہ کے حوالے کر دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی مگر ہونٹ بے حس اور بے جان ہو چکے تھے۔

میّت کو پیچھے لا کر امانت کے طور پر شکر گڑھ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ تقریباً دو ہفتے بعد اس کا والد روز علی آیا اور قبر سے تابوت نکلوا کر اپنے گاؤں موہڑہ حیات تحصیل گوجر خان لے گیا۔ اس کے بعد شہید کو پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز "نشانِ حیدر" دیا گیا۔

سوار محمد حسین تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی کے گاؤں موہڑہ حیات میں ۱۸ جون ۱۹۴۹ء کے روز پیدا ہُوا تھا اور ۱۹۶۶ء میں فوج میں بھرتی ہُوا۔ شہید ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور کنبے کا کفیل ——— اس کے والدِ محترم روز علی بہت ہی غریب کاشتکار ہیں جن کی اپنی زرعی زمین کُل تین کنال ہے۔ ان کا گزارہ محمد حسین شہید کی تنخواہ پر تھا۔ شہید کی جیب سے ایک سو پانچ روپے اور ایک خط برآمد ہُوا

تھا جو اس نے والدِ محترم کے نام لکھ رکھا تھا۔ اس میں شہید نے انہیں لکھا تھا کہ میں ایک سو روپیہ بھیج رہا ہوں۔ اس سے قرض ادا کر دینا ——— شہید کی ایک بچی ہے جس کی عمر اڑھائی سال ہے اور تین ماہ کی عمر کا ایک بچہ جسے شہید نے ابھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

پہلے نشانِ حیدر کیپٹن سرور شہید بھی تحصیل گوجر خان کے رہنے والے تھے۔ محمد حسین اکثر کہتا تھا کہ پوٹھوہار نے پاکستان کو ایک نشانِ حیدر دیا ہے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ پوٹھوہار سے ایک اور نشانِ حیدر پیدا ہو۔ وہ کیپٹن سرور شہید کو بہت یاد کیا کرتا تھا۔

حرفِ آخر

نارووال کی سرحد کا یہ خطہ جہاں گجگال، ہرڑ خورد اور ہرڑ کلاں، گدر پور اور کھیڑا واقع ہیں، جھومتے، لہلہاتے فصلوں کی ہریالی کا خوشنما سمندر ہے۔ سمندری لہروں کی طرح لہلہاتے گندم کے ہرے بھرے خوشوں کے درمیان کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ کھڑے بہت ہی خوبصورت لگتے ہیں۔ آج اس خطے کے حسن کو دیکھو تو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں خاک و خون کا بڑا ہی بھیانک ڈرامہ کھیلا گیا ہے، اور اس روح افزا خطے نے حق و باطل کے معرکے میں ایک نشانِ حیدر پیدا کیا ہے۔

اس خطے کی ہریالی میں پاکستان کی ماؤں کے جگر کا خون شامل ہے۔ ہمارے سرفروش مجاہدوں نے گجگال، ہرڑ خورد، ہرڑ کلاں اور سرحد کے ایسے بے شمار چھوٹے چھوٹے گمنام اور غیر اہم سے گاؤں کو بدر، حنین، اجنادین، اُحد اور قادسیہ کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

اور شجاعت کی اس داستان کا حاصل یہ ہے کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ فراست علی شاہ اور سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد بشیر خان خاکرانی جیسے کمسن لڑکوں نے روس کے جدید ترین ٹی ۵۵ ٹینکوں کی جدت اور وہشت کو شرمن جیسے قدیم

اور بیکار ٹینکوں سے توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

فضا میں بھی روس کی برتری کو جس کی علامت ایس یو ۷، تھی، ہمارے شاہبازوں نے سیبر جیسے قدیم اور سست رفتار طیاروں سے جلا کر راکھ کیا ہے۔

اور اس داستانِ شجاعت کا حاصل یہ ہے کہ ایک مفلس کاشتکار کے بیٹے نے قوم پر ثابت کر دیا ہے کہ پاک فوج راشن اور تنخواہ نہیں مانگتی ایمونیشن اور اسلحہ مانگتی ہے۔ دس شرمن ٹینکوں سے دس گنا سنچورین اور ٹی ۵۵ ٹینکوں کو تباہ کرنے والے اور سیبر طیاروں سے ایس یو، کو مار گرانے والے مقبوضہ کشمیر کو ہی نہیں، سارے کے سارے ہندوستان کو پاکستان میں شامل کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انہیں لڑنے کے لیے بارود اور اسلحہ دو۔ شہروں میں بیٹھ کر فوج پر نکتہ چینی کرنے والے ذرا سرحدوں پر آکر دیکھیں کہ ہم کونسے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں، ہماری نفری کیا، ہماری قوت کیا اور ہمارے مقابلے میں دشمن کی طاقت اور نفری کیا تھی اور اس کا اسلحہ بارود کیسا تھا۔ پھر بھی ہم نے ہندو کی کمر توڑ دی ہے اور بیکار اور ناکافی اسلحہ سے ملک کو بچا لیا ہے۔

دو پلوں کی کہانی

جب شاستری نے رن کچھ میں شکست کھا کر اگست ۱۹۶۵ء کے آخر میں ٹیٹوال سیکٹر میں اپنی پسند کا محاذ کھولا تو پاکستان اور آزاد کشمیر نے ایسے جانباز پیدا کیے جنہیں پاکستان کی تاریخ نے ابھی پہچانا نہیں۔ وہ دشمن کے علاقے میں دشمن کی ہر طرف پھیلی ہوئی اور آگ اگلتی فوجوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دو دو چار چار کی ٹولیوں میں گئے اور پلوں کو اڑا کر دشمن کی سپلائی لائن کی رگیں کاٹ ڈالیں۔

خدا کے سوا انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے کہ انہوں نے اپنا مشن مکمل کر دیا ہے۔ انہوں نے جانوں کی قربانیاں دے کر ثابت کر دیا کہ انہیں جو حکم ملا تھا اسے وہ کسی انسان کا نہیں، خدا کا حکم سمجھ کر آتشِ نمرود میں کود گئے تھے —— اور خدا گواہ ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل جان پر کھیل کر کی۔ ان میں کئی ایک جانباز پلوں میں اپنے ہی ہاتھوں لگائے ہوئے بارود سے پلوں کے ساتھ ہی اڑ گئے۔ ان کی لاشیں نہ ملیں، جنازہ نہ اٹھا اور قبر نہ بنی اور جن کی لاشیں محفوظ رہیں، انہیں ساتھیوں نے سنگینوں سے سنگلاخ وادیوں میں قبریں کھود کر وہیں کہیں دفن کر دیا جہاں نہ کوئی دیا جلانے جاتا ہے نہ کوئی جا کے فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔

لاریب وہ بڑے ہی دلیر تھے، بہت ہی غیور تھے جو وطن کی قربان گاہ

پر قربان ہوگئے مگر انہیں ہماری تاریخ نہیں پہچانتی کیونکہ قوم نے ان کے کارناموں
کی GUNS OF NAVARON اور WHERE EAGLES DARE جیسی
کوئی فلم نہیں بنائی اور قوم نے ارنسٹ ہیمنگوے جیسا کوئی ناول نویس پیدا
نہیں کیا جو ان کے لیے FOR WHOM THE BELL TOLLS جیسا ناول لکھتا
کسی قلم کار کو ہمت نہ ہوئی کہ THEY DIED WITH BOOTS ON جیسی
کہانی لکھتا۔ ہاں، ہمارے فلم کاران انگریزی کہانیوں کا ترجمہ فوراً کر لیتے ہیں اور
ہمارے ناشران تراجم کو فوراً چھاپ لیتے ہیں اور اس طرح دونوں چند سو روپے
کما لیتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ میں چند ایک ایسے جانبازوں کی داستانِ شجاعت
سناؤں جنہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں مقبوضہ کشمیر میں دو پل جان پر کھیل کر اڑائے
تھے، میں قوم کی اس بے حسی کا ماتم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سکولوں اور کالجوں میں
اپنے بچوں کو ابھی تک انگریزوں کی بہادری کی نظمیں ازبر کرائے جا رہے ہیں۔
کسی نصابی کتب میں اپنے کسی جانباز کی کوئی کہانی نہیں ملتی۔ جنگِ ستمبر میں پاک فوج
اور آزاد کشمیر فوج اور غیر فوجی مجاہدوں نے کمانڈو اپریشن میں جانبازی کے ایسے
مظاہرے کیے ہیں جن کے سامنے امریکہ اور برطانیہ کی بنائی ہوئی جنگی فلمیں کوئی
حیثیت نہیں رکھتیں مگر ہم عشق و محبت کے ناول لکھنے اور لچر فلمیں بنانے میں مصروف
ہیں جبکہ کفار ہماری نئی پود کو اپنی بہادری کے کارنامے پڑھا پڑھا کر اور سینما سکرین
پر دکھا دکھا کر پاکستانی شجاعت کو ان کے ذہنوں سے صاف کرتے چلے جا رہے
ہیں۔

وہ نوجوان لاہور کا رہنے والا تھا جسے لاہور کے گلی کوچے نثار احمد کے نام سے
اور پاک فوج کیپٹن نثار احمد کے نام سے جانتی پہچانتی تھی۔ لاہور کے گلی کوچے اُسے
فراموش کر چکے ہیں اور پاک فوج میں اُس کا نام کاغذوں کے انبار میں کہیں دب
گیا ہے۔ نثار کی کوئی قبر نہیں۔ جب شاستری نے اپنی پسند کا محاذ کھولا تو نثار دشمن
کی سپلائی لائن کو درہم برہم کرنے کے لیے مقبوضہ کشمیر میں دو پل اُڑانے گیا تھا۔ اُس
نے جنوں کی طرح دشمن کے علاقے میں جا کر دونوں پل اُڑا دیئے تھے مگر وہ واپس

نہیں آیا۔ اُس کی یادگار ایک نوجوان اور اُداس اُداس سی لڑکی شمیم ہے جس نے
اپنا سہاگ نثار کے روپ میں کشمیر پر نثار کر دیا ہے۔ اور نثار کی یادگار ایک بھولی
بھالی، بڑی سی پیاری بچی، ارم ہے جو باپ کی شہادت کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ نثار
اور شمیم کی شادی فروری ۱۹۶۵ء میں ہوئی اور ارم جنوری ۱۹۶۶ء میں پیدا ہوئی تھی۔
اور یہ کہانی آزاد کشمیر کے ایک سویلین مجاہد عبدالرحمٰن کی ہے جو ایک
پل میں بارود لگا کر پل کے ساتھ ہی اُڑ گیا تھا۔ اور یہ کہانی آزاد کشمیر کے
ایک اور سویلین مجاہد حافظ عطاء اللہ کی بھی ہے جو کیپٹن نثار کے ساتھ اس عرضداشت سے
رضاکارانہ طور پر گیا تھا کہ ڈوگروں نے اس کے کنبے کے کئی ایک افراد کو مقبوضہ کشمیر
میں شہید کر دیا تھا۔ یہ جوشِ انتقام تھا جو اسے کیپٹن نثار کے ساتھ لے گیا تھا۔
شاستری نے جب رن کچھ میں منہ کی کھا کر یہ دھمکی دی تھی کہ ہم اب اپنی پسند
کے محاذ پر لڑیں گے تو اُس کے پیشِ نظر اپنی فوج کے وہ پہاڑی ڈویژن تھے
جو پنڈت نہرو نے چین کے ساتھ جنگ کا ڈھونگ رچا کر امریکہ سے تیار کروائے
تھے۔ انہی پہاڑی ڈویژنوں کے بل بوتے پر بھارتی ہائی کمان نے کشمیر میں ٹیٹوال
سیکٹر کے پہاڑی علاقے کو اپنی پسند کا محاذ بنایا تھا۔ بھارتیوں نے بجا طور پر
سوچا تھا کہ پاک فوج اس دشوار علاقے میں نہیں لڑ سکے گی کیونکہ اس کے پاس
کوئی پہاڑی ڈویژن نہیں ہے، مگر شاستری، جنرل چوہدری اور بھارت کے جنگی دیوتا
یہ بھول گئے تھے کہ پاک فوج میں ایسے جانباز موجود ہیں جو جنوں اور بھوتوں کی طرح
ان کے علاقے میں جا کر ان کے پہاڑی ڈویژنوں کے راستے بند کر دیں گے اور ان
کی سپلائی لائن کاٹ کر انہیں بیکار کر دیں گے۔
ٹیٹوال سیکٹر میں بھارتیوں کا حملہ شدید تھا۔ اس سیکٹر کے عقب میں، دشمن
کے علاقے میں دُور اندر دو ندیاں بہتی ہیں جن پر دو پل تھے۔ ان پلوں کو اُڑا
دینے سے دشمن کے اگلے دستوں کو ایمونیشن، تیل پٹرول اور راشن سے محروم
کیا جا سکتا تھا۔ یہ دونوں پل ایک دوسرے کے قریب نہیں تھے۔ دونوں ندیوں
کا درمیانی فاصلہ پندرہ سولہ میل تھا۔ انہیں ایک ہی بار جا کر نہیں اڑایا جا سکتا
تھا۔ یہ دو الگ الگ مشن تھے۔ ایک پل سیمنٹ کا بہت ہی مضبوط پل تھا

اور دوسرے کے ستون سیمنٹ کے تھے اور اوپر لکڑی کے بہت ہی موٹے اور مضبوط تختے لوہے کے نٹ بولٹوں سے جوڑے ہوئے تھے۔ دونوں پُلوں کی حفاظت کے لیے بھارتی فوج کی نفری مورچہ بند تھی۔ ان مورچوں میں دیگر سمال آرمز (چھوٹے ہتھیاروں) کے علاوہ مارٹر اور مشین گنیں بھی تھیں۔ پُلوں پر سنتری کھڑے رہتے تھے اور پُل ہر لمحہ مشین گن پوسٹوں کی نظر اور زد میں رہتے تھے۔

یہ تو بعد میں سوچنے والے امور تھے کہ پُل کتنے مضبوط ہیں اور ان کی حفاظت کتنی خطرناک ہے۔ سب سے پہلے سوچنے والا مسئلہ تو یہ تھا کہ پُلوں تک پہنچا کس طرح جائے جبکہ سارے علاقے میں انڈین آرمی پھیلی ہوئی ہے۔ اور دیہاتی لباس میں جو بظاہر سیدھے سادے لوگ پھرتے نظر آتے تھے وہ انڈین آرمی کی انٹیلی جنس اور فوجی پولیس کے افراد ہو سکتے تھے۔ کسی دیہاتی کو مسلمان سمجھ کر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔

مگر دونوں پُل اڑانے لازمی تھے۔

اور دونوں پُل اڑانے کے لیے پاک فوج کے انجینئرز کے کیپٹن نثار احمد کو منتخب کیا گیا۔

زندگی کے اہم ترین اور آخری مشن پر جانے سے پہلے نثار راولپنڈی اپنے گھر میں تھا۔ شادی کیے ابھی چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ شمیم کے ہاتھوں سے ابھی مہندی کی سُرخی بھی مدھم نہیں ہوئی تھی۔ نثار احمد اور شمیم ابھی میاں بیوی نہیں بلکہ دُلہا اور دُلہن تھے۔ جب نثار شمیم سے رخصت ہونے لگا تو شمیم کے ذہن میں وہ منظر نقش ہو کے رہ گیا جب نثار اس کی ساڑھی استری کر رہا تھا اور شگفتہ لہجے میں اسے کہہ رہا تھا کہ شمیم، کشمیر کو آزاد کرانے کا موقع پھر نہیں ملے گا۔ مقبوضہ کشمیر پر شکنجہ مضبوط کرنے کے لیے شاستری نے اپنی پسند کا محاذ کھول دیا ہے۔ مجھے اسلام کی غیرت نے پکارا ہے۔ مجھے رو کر نہیں ہنس کر رخصت کرنا۔ شہادت کے وقت میری آنکھوں کے سامنے تمہاری مسکراتی ہوئی صورت ہو تو بڑے سکون سے جان دے سکوں گا۔

جس دُلہن کی آنکھوں سے عروسی کا ابھی کاجل بھی نہ دُھلا ہو، وہ کتنی ہی دلیر

اور کتنی حریت پسند کیوں نہ ہو، اُس کے لیے اپنے رفیق کے یہ الفاظ کہ بڑے سکون سے جان دے سکوں گا، زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے کم نہیں ہوتے۔ پاکستان اور کشمیر کی آن ایک دُلہن سے بڑی ہی قیمتی قربانی مانگ رہی تھی۔ شمیم کے آنسو نکل آئے ــــ آج وہ منظر شمیم کی پلکوں میں نقش ہو گیا ہے اور ایک بات یاد ہے جو اس کے ذہن کی دیواروں سے دن کی روشنی میں اڑتے ہوئے اندھے چمگادڑ کی طرح ٹکراتی رہتی ہے، لیکن شمیم کے دل کے زخم کو یہ مقدس حقیقت سہلا لیتی ہے کہ نثار مرا نہیں شہید ہوا ہے۔

ملک و ملّت کی آن کی خاطر کسی نہ کسی کو شہید ہونا ہی پڑتا ہے۔ اب باری کیپٹن نثار احمد اور اس کے جانبازوں کی ایک قلیل جماعت کی تھی۔ شیوا مرہٹہ کی اولاد اٹھارہ برسوں کی تیاری کے بعد پاکستان کو تہہِ تیغ کرنے کے لیے کشمیر کی طرف سے یلغار کا آغاز کر چکی تھی۔ پہاڑی ڈویژن دندناتے چلے آ رہے تھے۔ اپنی انٹیلی جنس نے دشمن کے علاقے کے اندر دو پُلوں کی نشاندہی کی جنہیں اڑا دینے سے آگے آئے ہوئے دشمن کے لشکر کو سپلائی سے محروم کیا جا سکتا تھا۔

پُلوں کے متعلق یہ تشریح ضروری ہے کہ پُل وہی اہم نہیں ہوتا جو راوی اور جہلم جتنا بڑا اور مضبوط ہو۔ اکثر اوقات کشمیر جیسے پہاڑی علاقے میں کسی ندی پر چند گز لمبا پُل خواہ وہ لکڑی کا ہی کیوں نہ ہو فوجوں کی فتح اور شکست کے درمیان ایک فیصلہ کن عنصر بن جاتا ہے۔ راوی اور جہلم جیسے بڑے پُلوں کو بمبار طیارے آسانی سے تباہ کر سکتے ہیں لیکن پہاڑی علاقے کے چھوٹے چھوٹے پُل ہوا بازوں کے لیے اتنا چھوٹا ٹارگیٹ ہوتے ہیں جن پر ٹھکانے کی بمباری ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ طیارے کو بمباری کے لیے بہت کم بلندی پر لانا پڑتا ہے جبکہ پُل کی قریبی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دشمن کی طیارہ شکن گنیں موجود ہوتی ہے۔ جو طیارے کو آسانی سے نشانہ بنا لیتی ہیں اور اگر یہ گنیں نہ بھی ہوں تو تیز رفتار طیارہ نیچے سے اُٹھتے اور گھومتے وقت پہاڑیوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے چھوٹے چھوٹے مگر جنگی لحاظ سے بہت ہی اہم پُلوں

کو اُڑانے کے لیے چند ایک انسانوں کو قربانی دینی پڑتی ہے۔

کیپٹن نثار احمد انہی جانبازوں میں سے تھا جسے پہلا پُل اُڑانے کے لیے تیس جوان دیئے گئے۔ ان میں صوبیدار شیر عالم ان کا نائب کمانڈر تھا اور ان میں آزاد کشمیر کا رہنے والا نائیک محمد دین بھی تھا۔ کیپٹن نثار کے رہنما اس علاقے کے واقف کار آزاد کشمیر کے رہنے والے دو سویلین مجاہد تھے، عبدالرحمٰن اور حافظ عطا اللہ ـــــ جہاں پُل تھے وہ ان کی اپنی سرزمین تھی جس پر ہندو قابض تھا۔ ہندو نے ان کے گھر جلا ڈالے تھے، ان کے عزیزوں کو قتل کر دیا تھا اور ہندو ابھی تک کشمیر میں مسلمان کا قتلِ عام کر رہا تھا۔ اس لیے عبدالرحمٰن اور حافظ عطا اللہ پر دیوانگی طاری تھی۔

عبدالرحمٰن ایک پُل کو اُڑانے کے لئے زمین ہموار کر چکا تھا۔ وہ وہاں تک ہو آیا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اُس نے کیا کیا اور کس طرح گیا تھا اور یہ کسی کو معلوم ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ عبدالرحمٰن کا یہ خاموش سا کارنامہ اُن کارناموں میں سے ہے جو تاریخ کے دامن پہ آکر بھی راز ہی رہتے ہیں۔ ملک کی بقاء اور آئندہ جنگوں کے لیے سُودمند یہی ہے کہ یہ کارنامے راز ہی بنے رہیں۔

اب پہلا پُل اڑانے کے لیے کیپٹن نثار کو جاکر دیکھنا تھا کہ پُل کی لمبائی، چوڑائی اور ساخت کیا ہے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کس نوعیت کا ہے۔ گو اسے یہ ساری معلومات عبدالرحمٰن سے مل چکی تھیں لیکن کمانڈر کی حیثیت سے اسے خود جاکر جائزہ لینا ضروری تھا۔ اسے وہاں تک جانے اور واپس آنے کا راستہ یا راستے بھی دیکھنے تھے۔ نثار نے اپنے اگلے مورچوں سے دُور آگے جاکر اپنی تیس جوانوں کی جماعت کا عارضی اڈہ (بیس) بنایا۔ وہاں سے پُل تین میل دُور تھا۔ ایک اوسط درجے کی صحت والا آدمی تین میل کا سیدھا اور بے خطر راستہ ایک گھنٹے میں طے کر لیتا ہے مگر کیپٹن نثار کے بیس سے . . . پُل تک تین میل کا راستہ دہکتے ہوئے انگاروں میں سے گزرتا تھا۔ دُور دُور تک بھارتی فوج کے مورچے تھے۔ اوپر طیارے بھی کبھی کبھی اُڑتے تھے۔ اس علاقے میں گھومتے پھرتے دیہاتی بھی خطرناک تھے۔

گھاس کی پتی پتی اور اونچی نیچی ٹیکریوں اور پہاڑیوں کے پتھر بھی دشمن تھے۔ شاید ہی کوئی ٹیکری ایسی ہو جس پر دشمن کا مورچہ یا دیکھ بھال کا انتظام نہ ہو۔ دن ہو یا رات کہیں کوئی پتا ہلے تو مشین گنوں کے مُنہ کھل جاتے تھے ـــــ اور اس جہنم میں سے گزر کر کیپٹن نثار کو دیکھنا تھا کہ پُل کیسا ہے اور اسے کس طرح اُڑایا جا سکتا ہے۔

ایک شام کیپٹن نثار اس بے حد خطرناک مہم پر روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ صوبیدار شیر عالم، نائک محمد دین، عبدالرحمٰن اور حافظ عطا اللہ تھے۔ دشمن کے علاقے میں پہنچے تو رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ لیٹ گئے اور پیٹ کے بل رینگنے لگے۔ پتھریلی زمین پر رینگنا کس قدر صبر آزما ہوتا ہے؟ ـــــ اس سوال کا جواب آپ کو صرف اس صورت میں مل سکتا ہے کہ کبھی کہنیوں اور پیٹ یا گھٹنوں کے بَل صرف دس قدم پتھریلی زمین پر رینگ کر دیکھیے۔

آگے فصل والے کھیت آ گئے۔ جانبازوں کی یہ جماعت اب دشمن کے حلق سے اُتر کر پیٹ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح ایک ایک انچ فصل میں سرکنے لگے۔ دشمن کے گشتی دستے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ ذرا سی سرسراہٹ یا آہٹ انہیں اِدھر متوجہ کر سکتی تھی۔ سمت کا بھی خیال رکھنا تھا اور یہ بھی کہ رات گزرتی جا رہی تھی۔ عبدالرحمٰن اور حافظ عطا اللہ رہبر تھے۔

وہ رینگتے سرکتے گئے اور جب صبح کا دھندلکا چھٹنے لگا تو اس کے ساتھ ہی اُن کے سامنے ایک پُل کے خدوخال نکھرنے لگے ـــــ پُل اُن سے پچاس گز دُور تھا۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے تھے کیونکہ آگے کوئی آڑ نہیں تھی۔ وہ سارا دن وہیں چھُپے رہے اور گرد و پیش کا جائزہ لیتے رہے۔ دن کے وقت دشمن کے حفاظتی دستوں کے سنتری بدلتے رہے۔ دشمن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستانی جانباز اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے ہیں۔ پُل پر سے فوجی ٹرک گزر رہے تھے جو لینے اگلے مورچوں کے لیے سپلائی اور کمک وغیرہ لے جا رہے تھے۔ اس سے کیپٹن نثار کو پُل کی اہمیت کا اندازہ ہُوا۔

پُل کے متعلق جو مشاہدات کئے گئے ان کی تفصیل یہ ہے ـــــ پُل کے نیچے ندی بہتی ہے جو ساون کی بارشوں کی وجہ سے سیلابی ہے۔ پُل کی لمبائی ایک

سو پچاس فٹ اور چوڑائی اتنی کہ ٹینک اور ٹرک آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ پُل
کی بلندی تقریباً ایک سو فٹ پُل اینٹوں اور سیمنٹ کا بنا ہُوا ہے اور بہت مضبوط۔
پُل کی حفاظت کے لیے انڈین آرمی کی پوری پلاٹون ہے جس کی نفری پچاس سے کچھ
زیادہ ہے۔ یہ سکھ رجمنٹ کی پلاٹون تھی۔ سبھی سکھ تھے۔ ان کے پاس دیگر چھوٹے
ہتھیاروں کے علاوہ مارٹر گنیں بھی ہیں اور گرینیڈوں کا ہونا تو لازمی تھا۔ پُل کے دونوں
طرف اس پلاٹون کی پوزیشنیں ہیں جن میں مشین گنیں نصب ہیں۔ پُل کے دونوں
سروں پر مسلح سنتری کھڑے رہتے ہیں جن کی موجودگی میں پُل میں بارُود لگانا ناممکن
ہے۔

عبدالرحمٰن نے چند اور قیمتی معلومات بھی فراہم کریں۔ وہ یہ کہ یہاں صرف
پُل ہی نہیں بلکہ ایک عارضی سپلائی ڈمپ بھی ہے جس کے لیے ایک الگ حفاظتی
دستہ ہے اور یہاں ہر وقت چند ایک ٹرک کھڑے رہتے ہیں۔ اس ڈمپ کی
حیثیت دشمن کی سپلائی لائن کی ایک اہم کڑی کی تھی جسے پُل کے ساتھ تباہ کر کے
دشمن کے اگلے مورچوں کو کمزور کیا جا سکتا تھا چنانچہ فیصلہ ہُوا کہ پُل کے ساتھ ڈمپ
اور اس کے حفاظتی دستوں کو بھی ختم کیا جائے ——— اس فیصلے کا سب
سے زیادہ دشوار اور بہت ہی خطرناک پہلو یہ تھا کہ یہ کام جس قدر جلدی ہو سکے کیا
جائے۔ ایک ایک منٹ جو گزر رہا تھا، پاکستان کی عمر کم کرتا جا رہا تھا۔

کیپٹن نثار اور اس کے جانباز سارا دن وہاں چھُپے رہے۔ شام گہری ہونے
لگی تو واپسی کے لئے روانہ ہُوئے۔ انہیں ایک بار پھر انہی پُرخطر مراحل سے گزرنا پڑا جن
سے وہ گزر چکے تھے۔ وہ بخیر و عافیت اپنے بیس پر آ گئے اور پُل اور ڈمپ کو اڑانے
کی سکیم تیار کی گئی جس کے مطابق ہر ایک جوان کو اس کی ڈیوٹی سے اچھی طرح آگاہ کیا گیا۔
اس سکیم کے تحت اس بیس سے آگے ایک اور بیس بنایا گیا جہاں دس جوانوں کو بھیج
دیا گیا۔ انہیں ندی کے دوسرے کنارے تک پہنچ کر پوزیشنیں لینی تھیں۔ انہیں
بتا دیا گیا کہ انہیں کیا کام کرنا ہے۔ انہیں دوسری رات کے گیارہ بجے ایک خاص مقام
تک پہنچنا تھا۔

ان دس آدمیوں کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ندی کے دوسرے

کنارے تک پہنچنا تھا۔ کیپٹن نثار اور اس کے ساتھی جن مشکلات میں سے گزر
آئے تھے، ان دس جوانوں کو انہی مشکلات میں سے گزر کر سیلابی ندی بھی تیر کر پار
کرنی تھی اور یہ احتیاط بھی لازمی تھی کہ دشمن نہ دیکھ لے۔ یہ خاص طور پر پیشِ نظر
رکھیے کہ پہاڑی ندیوں کا پانی بہت ہی تیز ہوتا ہے اور اگر ندیاں سیلابی ہوں تو بہاؤ کی
تیزی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ طاقتور تیراک اگر ہار نہ جائیں تو بہاؤ انہیں دوسرے
کنارے اُس جگہ سے بہت دُور لے جاتا ہے جہاں تک وہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ تیزی
کے علاوہ پانی یخ ٹھنڈا ہوتا ہے ——— یہ دس جوان جن میں نائیک محمد دین بھی تھا،
بیس سے روانہ ہوگئے۔ ایک رات چھوڑ کر اگلی رات انہیں ندی کے دوسرے
کنارے والے مقام پر پہنچنا تھا۔ دشمن سے بچ کر وہاں تک پہنچنے کے لیے
جو راستہ منتخب کیا گیا وہ بائیس میل لمبا تھا جو انہیں رات کی تاریکی میں چل کر
یا رینگ کر اور دن کی روشنی میں کہیں چھُپ کر اگلی رات کے گیارہ بجے تک طے
کرنا تھا۔

دن گزر گیا تو کیپٹن نثار پھر پُل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اُس کے ساتھ صوبیدار
شیر عالم، عبدالرحمٰن اور حافظ عطاءاللہ خان تھے۔ وہ رات عبدالرحمٰن کے لیے امتحان کی
رات تھی۔ اُسے پُل کے نیچے بارُود (بتی والا ڈائنامیٹ) لگانا تھا۔ وہ چل پڑے اور
گزری ہوئی رات کی طرح وہ پتھروں پر اور پھر فصلوں میں دشمن کی گشتی پٹرولوں سے
بچ بچ کر ایک ایک انچ رینگتے اور اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں وہ گزشتہ رات
پہنچے تھے یعنی پُل سے پچاس گز دُور ——— اور عبدالرحمٰن قمیض کے اندر
کمر کے ساتھ ڈائنامیٹ باندھے ہوئے پُل کی طرف چل پڑا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ
وہ پُل پر ٹہلتے ہوئے سنتریوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر پُل کے نیچے وسط میں
ڈائنامیٹ لگا آئے گا۔ کیپٹن نثار اور اس کے دوسرے ساتھی دُعا کے سوا عبدالرحمٰن
کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

عبدالرحمٰن اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا ——— اور تھوڑی دیر
بعد وہ پُل کے نیچے والے حصے میں ڈائنامیٹ لگا کر واپس آ گیا۔ اُس نے ڈائنامیٹ
کی بتی کا آگ لگانے والا سرا پُل کے اُوپر رکھ کر اسے چھپا دیا کیونکہ اسے اب پُل

کے اُوپر جاکر آگ لگانی تھی۔

عبدالرحمٰن کا یہ کارنامہ تاریخ کا ایک راز ہے۔ عبدالرحمٰن کے ساتھیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ وہ دو سنتریوں کی موجودگی میں پُل کے ساتھ والے حصے میں ڈائنامیٹ لگانے میں کس طرح کامیاب ہُوا۔ یاد رہے کہ پُل کے نیچے کا مطلب پُل کے کسی ستون کے نیچے نہیں بلکہ ستون کے اوپر والے حصے میں جہاں پُل رکھا ہُوا ہوتا ہے۔

پُل کو اگلی رات اڑانا تھا۔ سکیم کے مطابق دس آدمیوں کو اس رات گیارہ بجے ندی کے پار ایک خاص مقام پر پہنچنا تھا۔ اُس طرف دشمن کا سپلائی ڈمپ تھا۔ انہیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی ایک دن درکار تھا۔ باقی بیس آدمیوں کو کیپٹن نثار کے ساتھ پوزیشن لینی تھی۔ عبدالرحمٰن ڈائنامیٹ لگا کر اس جگہ پہنچ گیا جو اسے بتائی گئی تھی۔ کیپٹن نثار کے بیس آدمی پوزیشن میں ٹھیک پہنچ گئے۔ ہر ایک کام نہایت خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ دس جوان صحیح وقت پر ندی کے پار پہنچتے ہیں یا نہیں۔ اب ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ کیپٹن نثار کو اطلاع دے سکتے کہ وہ پہنچ گئے ہیں اور کارروائی کے لیے تیار ہیں۔ صرف یہ طے ہُوا تھا کہ پہلی گولی کیپٹن نثار کی طرف سے چلے گی۔

صبح طلوع ہوئی۔ کیپٹن نثار، صوبیدار شبیر عالم، عبدالرحمٰن اور حافظ عطاء اللہ پُل سے پچاس گز دُور چھپے رہے۔ ان کے ساتھ جو بیس جوان تھے انہیں اِدھر اُدھر ایسی پوزیشنوں پر لگا دیا گیا جہاں سے انہیں پُل اڑنے کے ساتھ دشمن کی مشین گن پوسٹوں پر فائر کرنا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ایک دوسرے کو کوَر کر کے پیچھے بھی ہٹانا تھا۔

وہ دن ان جانبازوں کی زندگی کا بڑا ہی لمبا دن تھا اور یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ دن کس کس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کسی بھی لمحے کسی بھی طرف سے دشمن کے کسی گشتی دستے کا اِدھر سے گزر ہو سکتا تھا اور کسی بھی وقت پُل پر ٹہلتے سنتریوں کو ڈائنامیٹ کی بتی کا سرا نظر آسکتا تھا۔ اور یہ ابھی یقین نہیں تھا کہ پار والے دس جوان پار پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ سب سے اہم کام ابھی باقی تھا ــــ وہ تھا بتی کو

جاکر آگ لگانا۔

دن گزر گیا سورج کشمیر کی مظلوم پہاڑیوں کے عقب میں چھپ گیا۔ ان جانبازوں کی نظریں گھڑیوں کے چمکتے ہُوئے ہندسوں اور سوئیوں پر لگی ہوئی تھیں جو بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھیں اور گھڑیاں جانبازوں کے دلوں کی دھڑکن کے ساتھ ٹک ٹک کر رہی تھیں۔

وقتِ شہادت قریب آگیا تو عبدالرحمٰن اور حافظ عطاء اللہ اٹھے اور پُل کی طرف چل پڑے۔ انہیں پہلے پُل کے سنتریوں کو نہایت خاموشی سے ختم کرنا تھا۔ پھر عبدالرحمٰن کو ڈائنامیٹ کی بتی تک پہنچ کر آگ لگانا اور دونوں کو واپس آنا تھا۔

ایک سنتری پُل کے اس سرے پر کھڑا ہوا۔ یہ عبدالرحمٰن کا شکار تھا ــــ حافظ عطاء اللہ کا کام مشکل تھا۔ اُسے پُل پر سے گزر کر دوسرے سنتری کو جان سے مارنا تھا مگر خاموشی سے۔ دونوں رینگ رینگ کر پہلے سنتری کے قریب پہنچے۔ اس سکھ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی پاکستانی اُسے اس کے گھر آکر مار سکتا ہے۔ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ایک رسّی تھی وہ قریب جاکر چیتے کی طرح سنتری پر جھپٹا اور پیچھے سے رسّی اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر رسّی کو تیزی سے مروڑنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے زور کا جھٹکا دیا تو سنتری پیچھے کو گرا اور ذرا سا تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی لاش کو پُل کی سڑک سے پرے پھینک دیا گیا۔

دوسرا سنتری ڈیڑھ سو فٹ دُور اپنے ساتھی کے حشر سے بے خبر دوسرے سرے پر کھڑا اندھیرے میں سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ وہ عطاء اللہ کا شکار تھا ــــ آزاد کشمیر کے دونوں مجاہد لیٹ گئے اور پُل پر جنگلے کے ساتھ ساتھ رینگنے لگے۔ دونوں کے پاس رائفلیں تھیں عبدالرحمٰن اُس جگہ تک پہنچ گیا جہاں اُس نے گزشتہ رات ڈائنامیٹ لگایا تھا۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر بتی کا سرا ڈھونڈنے لگا۔

حافظ عطاء اللہ دوسرے سنتری کو ختم کرنے کے لیے چلنے ہی لگا تھا کہ سنتری کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے رات کا سکوت سنتری کی رائفل کے دھماکے سے لرز اٹھا اور وادی دھماکے کی گونج سے سال سال

کرنے لگی۔ حافظ عطاء اللہ نے عبدالرحمٰن کے مُنہ سے نکلی ہوئی 'ہائے' کی آواز سُنی اور اس نے ایک ثانیے میں اپنی رائفل کندھے سے لگائی اور سنتری پر گولی چلا دی۔ گولی ٹھکانے پر لگی اور سنتری گر پڑا۔ سنتری کی گولی عبدالرحمٰن کو لگ چکی تھی اور عبدالرحمٰن بتی کا سرا ڈھونڈ رہا تھا۔ حافظ عطاء اللہ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بتی کو آگ لگا رہا تھا۔ وہ دوڑ کر واپس آنے لگا مگر سنتری کی جو گولی عبدالرحمٰن کے جسم سے پار ہو گئی تھی وہ اپنا کام کر گئی تھی۔ عبدالرحمٰن کو بتی کو آگ لگانے کے لیے ہی زندہ رہنا تھا۔

یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلنے سے دشمن کی مشین گن پوسٹیں اور تمام تر حفاظتی دستہ بیدار ہو گیا۔ روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے اور زمین و آسمان روشن ہو گئے۔ حافظ عطاء اللہ کیپٹن نثار کے پاس پہنچ گیا۔ بہت سے بھارتی جن میں حفاظتی دستے کے افسر اور سردار وغیرہ ہوں گے پُل پر بھاگتے دوڑتے نظر آئے اور عین اُسی وقت دلوں کو ہلا دینے والا ایک دھماکہ ہُوا اور ایک بہت ہی بڑے قرمزی شعلے نے کشمیر کے اس گوشے کو روشن کر دیا۔ پُل کے پرخچے اُڑ گئے۔ عبدالرحمٰن اسی دھماکے اور اسی شعلے کی نذر ہو گیا۔

کیپٹن نثار کے سینے سے توپ کے دھماکے کی طرح نعرۂ تکبیر نکلا اور وادی میں اللہ اکبر کی گرج سنائی دی۔ ندی کے پار گرینیڈوں کے دھماکے اور ان دھماکوں میں اللہ اکبر کا نعرہ گرجا تو معلوم ہُوا کہ کیپٹن نثار کے دس جانباز مقررہ وقت پر اپنی پوزیشن میں پہنچ گئے ہیں۔

کیپٹن نثار اور صوبیدار شبر عالم پہلے ہی دیکھ چکے تھے کہ دشمن کی حفاظتی پوسٹیں کہاں ہیں۔ انہوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ دشمن میں بھگدڑ مچ چکی تھی اس لیے اپنے جانباز آگے چلے گئے۔ کیپٹن نثار روشنی راؤنڈ فائر کیے چلے جا رہے تھے جن کی روشنی سے اب کوئی بھارتی چھپ نہیں سکتا تھا۔ بھارتیوں کی خوفزدگی اور بوکھلاہٹ کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ ذہنی طور پر اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے اور دوسرے یہ کہ انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ ان پر کس طرف سے اور کتنی نفری سے حملہ ہو رہا ہے۔

ندی پار والے دس جانبازوں کا کمال یہ تھا کہ وہ دو انچ دہانے والی مارٹر گنیں بھی ساتھ لے گئے تھے جنہیں اٹھا کر سیلابی ندی تیر کر پار کرنا ممکن نہ تھا مگر انہوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ وہ گرینیڈوں اور مارٹر گنوں سے دشمن کے سپلائی ڈمپ کا صفایا کر رہے تھے۔ وہاں اب دھماکے اور شعلے تھے اور فضا میں گولیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہمارے جانباز یہ بھی جانتے تھے کہ دشمن کی کوئی پوری بٹالین آ کر انہیں گھیرے میں لے سکتی ہے لیکن وہ اپنے انجام سے بے نیاز مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔ بھارتیوں کی اب یہ حالت تھی کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور مر رہے تھے۔

یہ جنگ کُل پندرہ منٹ جاری رہی جس میں پُل بالکل اُڑ گیا۔ سپلائی ڈمپ اُڑ گیا۔ جو گاڑیاں جلتی ہوئی دیکھی گئیں وہ سات آٹھ تھیں اور سکھوں کی اس پلاٹون کا شاید ہی کوئی آدمی زندہ بچا ہو۔

اب واپسی کا مرحلہ شروع ہُوا۔ اب کے واپسی پہلے سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ اتنے دھماکوں نے دُور دُور تک دشمن کے دستوں کو چوکنا کر دیا تھا لیکن اپنے جانباز دوسرے دن بارہ بجے تک اپنے بیس پر واپس آ گئے۔ ان میں صرف عبدالرحمٰن نہیں تھا۔ سب نے بیس پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی اور متفقہ طور پر کہا کہ عبدالرحمٰن شہید کے بغیر اس مہم کی کامیابی ممکن نہیں تھی۔

تین چار روز بعد دوسرا پُل اُڑانا تھا۔ یہ ایسی ندی پر تھا جو پہلی ندی سے پندرہ سولہ میل دُور تھی۔ اور یہ پُل کیپٹن نثار کے بیس سے سات میل دُور تھا۔ وہاں تک پہنچنے کا راستہ پہلے پُل کے راستے سے زیادہ دشوار اور خطرناک تھا۔ گو یہ اطلاع ملی تھی کہ یہ پُل لکڑی کا ہے اور چھوٹا بھی لیکن سوال اُڑانے کا نہیں ہوتا، اصل مسئلہ پُل تک پہنچنے کا ہوتا ہے۔

کیپٹن نثار صرف ایک جوان کو ساتھ لے کر سحر کے وقت نکل کھڑا ہُوا۔ اسے اس پُل کا محلِ وقوع، ساخت، حفاظتی انتظامات اور آنے جانے کا راستہ دیکھنا تھا۔ وہ پہلے کی طرح دشمن کی نظروں سے بچتا، رینگتا سرکتا سات میل کا انتہائی پُرخطر فاصلہ طے کر گیا اور ایسی جگہ جا چھپا جہاں سے وہ پُل اور گرد و پیش کو دیکھ سکتا تھا۔

اس پُل کے ستون اینٹوں کے تھے اور اوپر مضبوط اور موٹی لکڑی کا پُل تھا
جس کی لمبائی تقریباً ایک سو فٹ تھی اور بلندی تقریباً پچاس فٹ۔ اس کے نیچے
بہتی ہوئی ندی بھی سیلابی تھی مگر یہ پہلے پل سے بہت زیادہ خطرناک تھا کیونکہ
اس کے بالکل قریب دونوں طرف اونچی ٹیکریاں تھیں جن پر دشمن نے مشین گن
پوسٹیں بنا رکھی تھیں۔ سنتری پُل پر نہیں بلکہ اونچی ٹیکریوں پر تھے جہاں سے وہ پُل اور
اردگرد کے سارے علاقے پر نہایت خوبی سے نظر رکھتے تھے۔ حفاظتی دستے کی نفری
پوری کمپنی یعنی ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی۔ سمال آرمز کے علاوہ ان کے پاس بڑی
مشین گنیں، مارٹر گنیں اور گرینیڈ بھی تھے۔ ان حفاظتی انتظامات اور بلند ٹیکریوں
کے درمیان بنے ہوئے پُل کو اڑانا خودکشی کے برابر تھا مگر پُل کو اڑانا لازمی تھا،
خواہ ساری جماعت کو جان کا نذرانہ دینا پڑے۔

کیپٹن نثار جائزہ مکمل کر کے کیڑوں کی طرح رینگتا اور چھپتا چھپاتا بیس پر آگیا۔
اپنی جماعت کو جمع کر کے پُل کے متعلق معلومات بتائیں اور جانبازوں سے کہا کہ
پرسوں شام تک یہ پُل وہاں نہیں ہونا چاہیئے، اسے اڑانے کے لیے، ہم سب
کو مرنا ہوگا۔ کوئی جوان قید نہ ہو۔ لڑو اور مرجاؤ۔ یہ پُل ہم سب کا خون مانگ رہا ہے۔
جوانو! خون دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ پُل، جو دشمن کے لیے بہت ہی اہم تھا، کیپٹن نثار اور اس کے جانبازوں
کے لیے چیلنج بن گیا۔ کیپٹن نثار نے پُل کو اڑانے کی سکیم تیار کی۔ چونکہ یہ لکڑی کا پُل
تھا اس لیے اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ سب سے مشکل
مرحلہ سارے پُل پر پیٹرول چھڑکنے کا تھا۔ کیپٹن نثار نے پیٹرول کے دو ڈرم (کین)
حاصل کر لیے۔ ہر ایک میں چار گیلن پیٹرول تھا۔

رات کے آٹھ بجے کیپٹن نثار اپنے جانبازوں کو ساتھ لے کے چل پڑا۔
اب کے انہیں دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونا تھا۔ اس جماعت میں عبدالرحمٰن شہید
نہیں تھا۔ اس کی جگہ آزاد کشمیر کا ایک اور سویلین مجاہد عبدالحمید تھا جس نے کہا کہ سب
سے زیادہ خطرناک کام جو صرف عبدالرحمٰن شہید کر سکتا تھا وہ میں کروں گا۔
جانبازوں کی یہ جماعت انہی دشوار اور خطرناک مراحل سے رینگ رینگ

کر گزری جن سے وہ پہلے گزر چکی تھی۔ زندگی اور موت پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔
بھارتی گشتی دستے اب پہلے سے زیادہ چوکنے ہو گئے تھے اور پُلوں کے حفاظتی
دستے اور زیادہ بیدار کر دیئے گئے تھے۔ جانبازوں کے لیے خطرات میں اضافہ
ہو گیا تھا اس لیے ان کی رفتار پہلے کی طرح تیز نہیں تھی ایک ایک قدم
پھونک پھونک کر چلتے تھے ——— اور وہ صبح چار بجے سے پہلے پُل کے
قریب پہنچ گئے۔ ابھی اندھیرا تھا۔ پُل کو جلانے کا وقت صبح پانچ بجے مقرر کیا
گیا۔

پیٹرول چھڑکنے کے لیے کیپٹن نثار نے تین آدمی چنے جن میں پہلا وہ خود
تھا، دوسرا نائک محمد دین اور تیسرا سویلین مجاہد عبدالحمید۔ اس موقعے پر دوسرے
سویلین مجاہد حافظ عطاء اللہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور التجا کی کہ اسے
بھارتیوں سے اپنے عزیزوں کے خون کا انتقام لینا ہے۔ اس کا گاؤں جہاں ڈوگروں
نے اس کے گھر کو جلا ڈالا تھا، اس پُل کے قریب ہی تھا۔ انتقام لینے کے لیے
اسے اٹھارہ برس انتظار کرنا پڑا تھا۔ کیپٹن نثار نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔
سحر کے چار بج رہے تھے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ٹیکریوں کی بلندی پر کھڑے
سنتریوں کو روشنی راؤنڈ فائر کیے بغیر پُل پر کوئی حرکت نظر نہیں آ سکتی تھی۔ خطرہ یہ تھا
کہ کوئی گشتی دستہ نہ آ نکلے۔ کیپٹن نثار نے ساری جماعت کو چٹانوں پر ڈیپلائے
کر دیا۔ پندرہ جوانوں کو آگے پوزیشن میں رکھا اور باقیوں کو تین سو گز پیچھے مورچہ بند کر دیا
تاکہ اگلی پوزیشن کو حفاظتی فائر دے کر پیچھے ہٹا سکیں۔ سکیم پُل کو اڑانے تک محدود نہیں تھی۔
کیپٹن نثار نے حکم دیا تھا کہ دشمن کی اس کمپنی کو بھی ختم کرنا ہے۔
سحر کی تاریکی ابھی چھٹی نہیں تھی کہ کیپٹن نثار اپنے تین جانبازوں، نائک محمد دین، مجاہد
عبدالحمید اور مجاہد حافظ عطاء اللہ کو ساتھ لے کر پُل کی طرف رینگنے لگا۔ دو پیٹرول کین ان
کے ساتھ تھے جنہیں وہ رینگتے ہوئے پوری احتیاط سے اٹھا اٹھا کر آگے رکھتے تاکہ
آواز پیدا نہ ہو۔

وہ پُل تک پہنچ گئے۔ عبدالحمید اور نائک محمد دین نے ایک ایک کین سنبھالا
وہ پُل پر سرک سرک کر پیٹرول چھڑکتے چلے گئے۔ کیپٹن نثار اور حافظ عطاء اللہ نے پُل کے

قریب پوزیشن لے لی تاکہ کوئی گشتی دستہ آجائے تو اسے سنبھال لیں۔

پٹرول چھڑک دیا گیا اور دونوں جانباز پٹرول پر رینگتے ہوئے واپس آگئے۔ انہیں دُور ہٹا دیا گیا کیونکہ ان کے کپڑوں پر بھی پٹرول پڑ گیا تھا۔ آگ ان تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ محفوظ فاصلے پر چلے گئے تو کیپٹن نثار نے دیا سلائی جلا کر پھینکی تو ایک مہیب شعلہ اُٹھا جس نے پلک جھپکتے ایک سوفٹ پھیل کر پُل کو جلانا شروع کر دیا۔

کیپٹن نثار تینوں جانبازوں کو ساتھ لیے تیزی سے دوڑتا پیچھے ایسی پوزیشن میں آگیا جہاں سے وہ ہر اس بھارتی کو ختم کر سکتا تھا جو پُل کی آگ بجھانے آتا۔ دشمن نے بلندی سے اندھا دُھند مارٹر گنوں کے گولے فائر کرنے شروع کر دیئے اور مشین گنوں سے سارے علاقے میں گولیوں کا مینہ برسا دیا۔ قیامت کا فائر تھا۔

کیپٹن نثار نے اپنے ایک جوان سے مشین گن لے لی اور دشمن کی پوسٹوں پر فائر کرنے لگا۔ اُسے معلوم تھا کہ پوسٹیں کہاں کہاں ہیں۔ اس کی ساری جماعت نے دشمن پر فائر کھول دیا جس سے دشمن کو پتہ چل گیا کہ ہمارے جانباز کہاں سے فائر کر رہے ہیں۔ دشمن نے تمام تر چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا بے تحاشہ فائر اس علاقے پر مرکوز کر دیا۔ نائک محمد دین زخمی ہو گیا۔ کیپٹن نثار اس کے قریب تھا۔ اس نے محمد دین کے زخم پر اپنے ہاتھوں پٹی باندھی اور اُٹھ کر اپنی ایک ایک پوزیشن میں جا کر جوانوں کا حوصلہ بھی بڑھانے لگا اور ساتھ ساتھ مشین گن سے فائر بھی کرتا جا رہا تھا۔

پُل جل رہا تھا۔ حفاظتی دستوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ قریب آ کر آگ بجھاتے۔ مگر انہوں نے فائر اس قدر کھول رکھا تھا کہ اپنے جانبازوں کے لیے پیچھے ہٹنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ساتھ ایمونیشن محدود تھا اور اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی کہ صبح کا اُجالا نکھرنے لگا تھا۔ دشمن بلندی پر تھا جہاں سے اُس کا فائر شدید اور کارگر تھا۔ ایسی نازک اور خطرناک صورتِ حال میں کیپٹن نثار ہر ایک جوان کے پاس جا جا کر اور دُور سے پُکار پُکار کر بھی سب کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پچھلی پوزیشن والے جوانوں کو فائر کی ہدایت دے کر اگلے جوانوں کو پیچھے ہٹا لینے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فائر کرتے ہوئے پیچھے ہٹیں۔

غالباً اسی رات یا شاید ایک دو راتیں پہلے شمیم نے ایک خواب دیکھا تھا جسے

وہ سوائے اس کے پوری طرح بیان نہیں کر سکتی کہ خاردار تار ہے، فوجی گاڑیاں ہیں اور ایک پُل ہے ——— اور کیپٹن نثار ایک پُل پر زندگی کا آخری معرکہ لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے جوانوں کو دیکھنے کے لیے ایک بار پھر اٹھا اور دشمن کی کسی مشین گن کا پورا برسٹ اس کے سر میں آن لگا۔ کیپٹن نثار نے شمیم کا سُہاگ کشمیر اور پاکستان پر قربان کر دیا۔ اُس کا زندگی کا مشن پورا ہو چکا تھا۔

فوراً بعد صوبیدار شیر عالم نے کیپٹن نثار کی جگہ لے لی لیکن صرف چند منٹ کے لیے۔ وہ بھی شہید ہو گیا۔ جوان تیزی سے زخمی ہو رہے تھے اور شہادت کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ دونوں کمانڈروں کی شہادت سے کسی کا حوصلہ پست نہ ہُوا۔ وہ پیچھے ہٹتے رہے اور اس انداز سے فائر کرتے رہے کہ دشمن کو مورچوں سے نکل کر گھیرا ڈالنے کی مہلت نہ دی۔ شہیدوں کی لاشوں کو پیچھے لانا ناممکن تھا لیکن جانباز کیپٹن نثار کی لاش اٹھا لائے۔

آخر وہ خطرے کے علاقے سے نکل آئے اور ایک میل دُور پہنچ گئے۔ وہ بھی دشمن کا علاقہ تھا جہاں سے اکیلے اکیلے بکھر کر رینگ اور چُھپ چُھپ کر اپنے بیس تک پہنچنا تھا۔ اس لیے کیپٹن نثار کی لاش کو پیچھے نہیں لایا جا سکتا تھا۔ جانبازوں نے لیٹ کر سنگینوں سے قبر کھودی اور اسی حالت میں نمازِ جنازہ ادا کر کے شمیم کے سہاگ کو نثار کی خون آلود وردی میں قبر میں رکھ دیا اور پر مٹی ڈال دی۔ سب نے قبر کو آخری سیلوٹ کیا اور وہاں سے چل پڑے۔ کہتے ہیں کہ کیپٹن نثار کے چہرے پر عزم کی چمک اور فتح کی رونق اور زیادہ نکھر آئی تھی۔

بیس پر آ کے دیکھا کہ کیپٹن نثار اور صوبیدار شیر عالم کے علاوہ سات جانباز شہید ہوئے تھے۔

اور کیپٹن نثار کی یادگار ایک دُبلی پتلی، شمیم نام کی اُداس اُداس سی لڑکی، کنٹونمنٹ بورڈ گرلز کالج راولپنڈی میں انگریزی کی لیکچرار ہے جو ۱۹۶۴ء میں ایم اے انگریزی میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئی تھی اور ۱۹۶۸ء میں انگلینڈ میں ایم اے (ریسرچ) کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں کرنل مختار احمد گیلانی صاحب کے ساتھ راولپنڈی میجر صبح صادق صاحب کے ہاں گیا تو وہاں ایک بڑی ہی پیاری بچی دیکھی۔ پوچھا، کس کی بچی ہے تو میجر صبح صادق

نے بتایا کہ یہ ایک گمنام ہیرو کی بچی ہے جو باپ کی شہادت کے بعد پیدا ہوئی تھی یہ بھی پتہ چلا کہ بچی کو ابھی بتایا نہیں گیا کہ اس کا باپ زندہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا شعور ابھی بیدار نہیں ہُوا۔ جب وہ موت اور شہادت کے درمیان فرق محسوس کرنے لگے گی تو اسے اس کے باپ کا کارنامہ سنایا جائے گا۔

شمیم سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ نثار جاتے وقت شادی کی انگوٹھی اور گھڑی اسے دے گیا تھا۔ اس کے پاس ایک اور گھڑی تھی۔ آخری بار اس نے کہیں سے ٹیلی فون کیا تھا اور کہا تھا کہ شاستری اپنی پسند کا محاذ کھول چکا ہے۔ دعا کرنا کہ میں سُرخرو ہو کے آؤں۔ اس کے بعد اس کے خطوط آئے۔ ہر خط جذبات سے بھرپور ہوتا تھا۔ آخری خط میں اس نے لکھا تھا کہ میں قوم سے غداری نہیں کروں گا۔ مجھے ایسا مشن دیا گیا ہے جس میں مجھے دیکھنے والا کوئی بڑا افسر نہیں ہوگا۔ دعا کرنا کہ ثابت قدم رہوں اور یہ مشن پورا کر سکوں۔

نثار تو اپنا مشن پورا کر گیا ہے، لیکن شمیم کا مشن ابھی پورا نہیں ہُوا۔ اسے تمام عمر نثار کے بغیر گزارنی ہے۔ اسے اپنی بچی کو جوان کر کے اسے اس کے باپ کا کارنامہ سنانا ہے اور اسے قوم کی ان تمام بیٹیوں کو جو اس کے کالج میں پڑھتی ہیں، یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ پاکستان کی مائیں وطن پر قربان ہونے والے جانباز پیدا کیا کرتی ہیں۔

کل کی حقیقت آج کا افسانہ

اس طوفان میں ہم اور آپ مل کر جو چراغ جلا رہے ہیں وہ بُجھنے والا نہیں۔ یہ وہ چراغ ہے جسے چودہ صدیاں گزریں غارِ حرا کی تاریکی نے نور بخشا تھا۔ اسے کُفر کی پھونکیں نہ کبھی بُجھا سکی تھیں نہ بُجھا سکیں گی۔ اسلام کے نام پر فدا ہونے والوں کے لہُو سے اس کی لَو تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان فدایانِ اسلام میں سے چند ایک کو آپ جانتے ہیں بہت سے ایسے ہیں جنہیں تاریخ بھی نہیں جانتی۔ ان میں سیالکوٹ سیکٹر کے گاؤں بھلورا کا رہنے والا یُوسا بھی ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی تاریکی میں بھارت نے پُورے ٹینک ڈویژن سے سیالکوٹ سیکٹر میں حملہ کیا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی ملک اُس وقت بریگیڈیئر تھے اور اُس بریگیڈ کی کمانڈ کر رہے تھے جو سیالکوٹ کی سرحد پر سامبا کے سامنے دشمن کے حملے کے انتظار میں مورچہ بند تھا۔ ان کی اپنی انٹیلی جنس اور مشاہدے کے مطابق دشمن نے سرحد کے قریب سامبا کے جنگل میں آرمرڈ ڈویژن جمع کر دیا تھا جس سے اسے سیالکوٹ پر حملہ کرنا تھا مگر ان کا ڈویژن کمانڈر میجر جنرل اسمٰعیل ان سے متفق نہیں تھا۔ دشمن نے جسڑ اور ظفروال کی طرف معمولی سا حملہ کر کے یہ دھوکا دیا کہ وہ بڑا حملہ اسی طرف سے کرے گا۔

ہمارے جنرل اسمٰعیل نے جنرل عبدالعلی کو حکم دیا کہ اپنی پوزیشن چھوڑ کر بریگیڈ ظفروال لے جاؤ۔ جنرل عبدالعلی نے اسے کہا کہ وہ دھوکا ہے۔ دشمن سامبا کی طرف سے آئے گا۔ حکم حکم ہوتا ہے، بحث اور اعتراض جُرم تصوّر کیا جاتا ہے۔ جنرل عبدالعلی اپنا بریگیڈ سامبا کے مورچوں سے اُٹھا کر ظفروال کی طرف

چل پڑے۔ دشمن یہی چاہتا تھا۔ اس کا دھوکا کامیاب ہو گیا۔ ہمارا یہ بریگیڈ
راستے میں ہی تھا کہ دشمن نے اُدھر سے ہی ٹینکوں کی پیش قدمی کر دی
سے جنرل عبدالعلی بتا رہے تھے۔ ظفروال کے علاقے میں بریگیڈیر (ا
لیفٹیننٹ جنرل) امیر عبداللہ خان نیازی تھے۔ ان کے پاس صرف ایک
پیادہ بٹالین، پرانے شرمن ٹینکوں کا ایک سکواڈرن اور توپ خانے کی
ایک بیٹری تھی۔ اتنی قلیل طاقت کے باوجود جنرل نیازی مطمئن تھے کیونکہ
بھی جانتے تھے کہ دشمن کا جسڑ اور ظفروال پر حملہ محض دھوکا ہے مگر انہوں
جنرل عبدالعلی کو رات کے وقت اپنے قریب دیکھا تو حیران ہوئے کہ یہ کیا حماقت
ہے؟ یہ حماقت ڈویژن کمانڈر کرا چکا تھا۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ دشمن اُ
علاقے میں آگیا ہے جو جنرل عبدالعلی سے خالی کروایا گیا ہے۔ اب یہ بریگیڈ
لڑنے کی پوزیشن میں نہیں آسکتا تھا۔ دشمن کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

اس صورتِ حال سے گھبرا کر ہمارے ڈویژن کمانڈر جنرل اسمٰعیل
پسپائی کا حکم دے دیا۔ حکم بھی ایسا کہ سیالکوٹ خالی کر دو اور دُور پیچھے مور
ہو کے دفاع میں لڑو۔ یہ صرف فوجی سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی تیز بکتر بند یلغار
آگے جو ٹروپس پیچھے ہٹتے ہیں وہ پھر کہیں اپنی مرضی سے مورچہ بند نہیں
سکتے۔ وہ دشمن کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ جنرل عبدالعلی اور جنرل نیا
اس صورتِ حال سے بچنا چاہتے تھے۔ جنرل عبدالعلی بریگیڈ کو واپس ا
طرف لے گئے جس طرف سے آئے تھے مگر اب وہ علاقہ دشمن کے ہا
تھا۔ انہوں نے ڈویژن کمانڈر کے اس حکم کو نظر انداز کر دیا کہ پیچھے ہٹو۔ ڈو
کمانڈر اپنا حکم منوانا چاہتا تھا اور پسپائی کا ہی حکم دُہرا رہا تھا۔ جنرل عبدالعلی
وقت بریگیڈیر تھے۔ فوجی قانون کے مطابق جرنیل کی حکم عدولی کورٹ مارشل
جُرم تھا مگر ان کے سامنے وہ کورٹ مارشل آگیا جو پسپائی کی صورت میں خدا
حضور ہوگا۔ انہوں نے اپنے جرنیل کا حکم ماننے سے انکار اور لڑ کر مرنے کا
کر لیا۔ جرنیل اور بریگیڈ کے درمیان تُرش کلامی بھی ہوئی جس میں جنرل عبدا
نے ریوالور نکال لیا اور جنرل اسمٰعیل سے کہا کہ میں تمہیں گولی مار دوں گا، بریگیڈ

پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔ جنرل اسمٰعیل نے ہائی کمان کو رپورٹ دی۔ ایوب خان مرحوم
اور جنرل مُوسیٰ نے یہ عقلمندی کی کہ جنرل اسمٰعیل سے ڈویژن کی کمان لے لی۔ اس
کی جگہ اپنے پندرھویں انفنٹری ڈویژن کی کمان جنرل ٹکا خان کو دے کر انہیں
سیالکوٹ سیکٹر دے دیا گیا اور جنرل ابرار حسین جو اپنے آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر
تھے، انہیں چونڈہ سیکٹر دے دیا گیا جہاں ٹینکوں کی ہولناک جنگ لڑی گئی۔

کمانڈ میں یہ ردّوبدل تو کر دیا گیا مگر اُس وقت دشمن وسیع علاقے پر قابض
ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے گاؤں، پوری پوری آبادی سمیت اس کے قبضے میں
آچکے تھے۔ اُس وقت میدانِ جنگ دشمن کے ہاتھ تھا۔ یہ ایک جرنیل کی حماقت
اور نااہلی کا نتیجہ تھا، ورنہ جنگِ ستمبر کا انجام بالکل ہی مختلف ہوتا۔ دشمن کو وہاں
سے جہاں وہ پہنچ چکا تھا آگے نہ آنے دیا گیا مگر اُس کی جو قیمت دی گئی وہ رونگٹے
کھڑے کر دیتی ہے۔ ہماری ایک فرنٹیئر فورس رجمنٹ جو سب سے اگلے مورچوں
میں تھی بُری طرح کُچلی گئی۔ تقریباً پوری بٹالین سیالکوٹ پر قربان کرنی پڑی۔ اپنی
صرف ایک ٹینک رجمنٹ آگے تھی۔ تین دنوں میں اس رجمنٹ کی کیفیت یہ ہو گئی
کہ اس کے پاس جو ٹینک تھے وہ تباہ ہوتے رہے اور اسے نئے ٹینک ملتے
رہے۔ چوتھے روز اس کے تمام ٹینک نئے تھے لیکن اس رجمنٹ نے جو سہ روزہ
معرکہ لڑا وہ شجاعت کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

یہ تو فوجی شجاعت کی بڑی لمبی داستان ہے کہ ہماری نو ہزار پیادہ نفری
اور ڈیڑھ سو ٹینکوں نے دشمن کی پچاس ہزار نفری اور چھ سو ٹینکوں کا کس بے جگری
سے مقابلہ کیا اور اسے اس جگہ سے آگے نہ بڑھنے دیا گیا جہاں وہ پہنچ چکا تھا۔
بلکہ اس سے کچھ علاقہ لیا بھی گیا۔ ہم نے آپ کو بھلورا کے ٹِوسا شہید کی کہانی
سنانے کے لیے یہ وسیع پس منظر خاصے اختصار سے سنایا ہے۔ دشمن نے
جن دیہات پر قبضہ کیا وہاں کی آبادی بھی اس کے قبضے میں آگئی۔ یہ ہمارے
حکمرانوں کی بہت بڑی غلطی تھی کہ ۳۱۔ اگست ۱۹۶۵ء کی رات چھمب پر حملہ کر کے
جب یہ صورت یقینی طور پر سامنے آگئی تھی کہ بھارت پاکستان پر جوابی حملہ کرے گا،
سرحدی دیہات سے آبادی کو قبل از وقت نہ نکالا گیا اور انہیں ہندو جیسے

ذلیل اور کمینے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس آبادی میں نوجوان لڑکیاں
اور عورتیں بھی تھیں۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ دشمن نے ان کا کیا حشر کیا ہوگا۔
بھارت کے دو تین تباہ شدہ ٹینکوں میں سے بھی جوان لڑکیوں کی لاشیں برآمد
ہوئی تھیں۔ اس آبادی میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے۔ ان کا انجام بڑا
ہی بھیانک تھا۔ جو آدمی جوان تھے ان میں سے ان تمام کو گولی مار دی گئی جن
پر شک تھا کہ وہ پاکستان کی مدد کریں گے یا بھاگ جائیں گے۔ بعض کو غیر انسانی
اذیتیں دے دے کر شہید کیا گیا اور جن پر اعتماد کیا گیا، انہیں مورچے کھودنے
اور سامان اُٹھانے کے کام پر لگا دیا گیا۔

ان معصوم اور مظلوم دیہاتیوں کو ایک مقام پر بھارتیوں نے انسانی
ڈھال کے طور پر بھی استعمال کیا جس کی مثال جنگ کی کسی بھی تاریخ میں نہیں
ملے گی۔ بھارتیوں کی ایک پوزیشن پر ہمارے ٹروپس نے حملہ کیا لیکن انہوں نے
فوراً فائر روک دیا کیونکہ دشمن نے اپنے مورچوں کے سامنے ہمارے دیہات
کی عورتوں اور بچوں کو کھڑا کر رکھا تھا۔ ہمارے ٹروپس نے حملہ ملتوی کر دیا۔
اُدھر عورتوں اور بچوں کو بھارتیوں نے اپنے مورچوں میں بٹھا لیا۔ ایک بار پھر
حملہ کیا گیا اور دشمن نے ایک بار پھر ہماری عورتوں اور بچوں کو اپنے مورچوں
کے سامنے کھڑا کر دیا —— ہمیں یہ واقعہ جس کیپٹن نے سنایا تھا اس نے
یہ نہیں بتایا کہ ان عورتوں اور بچوں کا کیا حشر ہوا تھا جنہیں دشمن نے انسانی
ڈھال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ کیپٹن نے اتنا ہی بتایا کہ اگلے روز اس نے
حملہ کر کے دشمن سے یہ پوزیشن لے لی تھی لیکن اس نے ان معصوموں کا حشر
نہیں بتایا۔ اس کے آنسو بہنے لگے تھے اور پھر اس کی ہچکیاں نکل گئی تھیں۔ وہ
کچھ بتا نہیں سکا تھا۔ اس کی ہچکیاں یہ المیہ بیان کر رہی تھیں۔

پھلورا کے لیے ٹینکوں کا خونریز معرکہ لڑا گیا تھا مگر یہ گاؤں دشمن کے
قبضے میں رہا۔ چند دن بعد ہمارے ایک حملے میں دشمن ایک پوزیشن سے پسپا ہوا۔
پیچھے بہت سی لاشیں اور زخمی جنگی قیدی چھوڑ گیا۔ ان میں بھارت کی کسی ٹینک
رجمنٹ کا دفعدار رُوپ چند بھی تھا۔ اُس کا ٹینک تباہ ہو گیا تھا۔ وہ زندہ نکل آیا

لیکن پکڑا گیا۔ پاکستان کے ایک فوجی ہسپتال میں آکر وہ اس خوف سے مرا جا رہا
تھا کہ اس کا علاج معالجہ نہیں ہوگا۔ اُسے بھوکا رکھا جائے گا اور وہ اذیت میں
مرے گا لیکن یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ ہماری نرسوں، نرسنگ سپاہیوں اور
ڈاکٹروں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہ اپنے زخمی جوانوں کے ساتھ
کرتے تھے۔ تحفے جو شہریوں کی طرف سے آتے تھے اُن میں سے اُسے بھی دیئے
جاتے تھے۔ ایک روز وہ بچوں کی طرح رو پڑا اور ہمارے ایک کیپٹن ڈاکٹر کے
ہاتھ پکڑ کر چومنے لگا۔ اس کا ضمیر اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے اقبالِ جرم
کرتے ہوئے ڈاکٹر کو بتایا کہ اُس نے، اس کے افسروں نے اور اس کے ساتھیوں
نے سیالکوٹ کے سرحدی دیہات کی آبادی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا
ہے۔ اس نے ہمارے ڈاکٹر سے روتے ہوئے کہا —— "میرے ساتھ اتنا اچھا
سلوک نہ کرو ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔"

اس نے وہ سارا سلوک بتایا جو اس کی رجمنٹ نے ہمارے دیہاتیوں
کے ساتھ کیا تھا۔ اس شرمناک روئیداد کے ساتھ اس نے یُوسا شہید کا بھی واقعہ
سنایا۔ پھلورا اور اس کے اِرد گرد چھوٹے چھوٹے گاؤں کی آبادی کو انہوں نے
ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ لڑکیوں اور جوان عورتوں کو الگ کر لیا اور جو آدمی قابلِ اعتبار
ثابت ہوئے انہیں مختلف کاموں پر لگا دیا گیا۔ دفعدار رُوپ چند کا سکواڈرن
چند دن پھلورا میں رہا۔ اسے جو دیہاتی کام کے لیے دیئے گئے ان میں یُوسا
بھی تھا۔ اس ہندو دفعدار کے کہنے کے مطابق یُوسا غریب اور بُدھو سا دیہاتی
تھا۔ اس کا نام یوسف تھا۔ اسے گاؤں میں یُوسا کہتے تھے۔ اس کی عمر چالیس
سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کی عمر گاؤں والوں کے حکم بجا لاتے گزری تھی۔
وہ اتنا سیدھا سادا تھا کہ اس بھارتی ٹینک سکواڈرن والے اسے جو بھی کام
بتاتے وہ سر جھکا کر وہ کام کر دیا کرتا تھا۔

سکواڈرن کے جوان اس سے گاؤں کی لڑکیوں کے متعلق پوچھتے رہتے
تھے۔ دفعدار رُوپ چند نے بتایا کہ اس نے بھی یُوسا سے کہا تھا کہ کسی گاؤں
سے کوئی چھپی ہوئی لڑکی لے آؤ لیکن یُوسا نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا

اور وہ رو بھی پڑا تھا۔ اس سے بھارتی اپنے ہتھیار اور بوٹ بھی صاف کراتے تھے۔ ایمونیشن کے بکس بھی اُٹھواتے تھے۔ یُوسا پر اس دفعدار کو بہت بھروسہ تھا۔ یُوسا نے ایک روز اس سے ٹینک کے متعلق پُوچھا کہ اس میں کیا ہوتا ہے رُوپ چندر نے اسے بتایا کہ ٹینک بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کے ساتھ توپیں، مشین گنیں لگی ہوتی ہیں اور ان کا ایمونیشن ٹینک کے اندر رکھا جاتا ہے۔

اسی شام یُوسا سے ایمونیشن کے بکس اٹھوائے گئے۔ ان میں کچھ بکس گرینیڈوں کے تھے۔ کھولے گئے تو یُوسا نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ رُوپ چندر نے اسے بتایا کہ یہ گرینیڈ ہے۔ پھر اسے گرینیڈ کی تباہ کاری بتائی۔ ایک گرینیڈ یُوسا کے ہاتھ میں تھا۔ ایک میجر نے دیکھ لیا۔ اس نے آکر یُوسا کے منہ پر تھپڑ مارا اور گرینیڈ اس کے ہاتھ سے لے کر دفعدار رُوپ چندر کو ڈانٹ پلا دی اور کہا کہ یہ جاہل دیہاتی اس کی پن نکال دے تو تم جانتے ہو کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ میجر نے یُوسا کے منہ پر دو تین اور تھپڑ جڑ دیئے۔

میجر کے جانے کے بعد یُوسا اکڑوں بیٹھ گیا۔ رُوپ چندر نے یہ واقعہ سُناتے ہُوئے کہا ——— "میں نے گاؤں کی عورتوں اور مردوں کے ساتھ بہت بدسلوکی کی تھی۔ تین جوان آدمی سٹین گن سے مارے تھے لیکن یُوسا مجھے اچھا لگتا تھا۔" ——— اس نے یُوسا کو جا کر اُٹھایا اور تسلی دی۔ یُوسا نے اُس سے پوچھا کہ اس افسر نے کیا کہا تھا؟ رُوپ چندر نے اسے گرینیڈ دکھا کر کہا کہ یہ جو چھلا ہے اسے کھینچ کر یہ پن نکال دو اور یہ گرینیڈ پھینک دو تو یہ پھٹ جاتا ہے۔ یُوسا نے پوچھا ——— "اُس سے آدمی مر جاتے ہیں؟" ——— دفعدار رُوپ چندر نے جواب دیا ——— "تم آدمی کہتے ہو، یہ اگر ٹینک کے اندر پھینک دو تو ٹینک تباہ ہو جاتا ہے۔"

دوسرے دن جو جنگ کا پانچواں دن تھا، رُوپ چندر کا سکواڈرن آگے چلا گیا۔ جنگ کا بہت زور تھا۔ پاکستانی چھلورا واپس لینے کے لیے لڑ رہے تھے۔ شام پانچ بجے یہ بھارتی سکواڈرن واپس آ گیا۔ شام کے وقت ٹینک پیچھے لے جائے جاتے تھے کیونکہ سورج غروب ہونے کے بعد ٹینک اندھے

ہو جاتے ہیں۔ رُوپ چندر کے ٹروپ میں چار ٹینک تھے۔ چھلورا کے مضافات میں انہیں الگ الگ درختوں کے نیچے کھڑا کر دیا گیا۔ ایمونیشن فائر ہو چکا تھا۔ ان میں نیا ایمونیشن رکھا گیا۔ پٹرول بھر دیا گیا اور ٹینک اگلی صبح کے لیے تیار ہو گئے۔ سورج غروب ہو گیا۔ دفعدار رُوپ چندر نے بتایا کہ یُوسا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اسے یُوسا نظر آ گیا۔ یُوسا اس کے ٹینک پر چڑھ رہا تھا جو رُوپ چندر سے تقریباً پچاس گز دُور تین چار اکٹھے درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ رُوپ چندر نے اسے آواز دی تو یُوسا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ——— "آتا ہُوں"۔

یہ ٹینک اُوپر سے کُھلا تھا۔ اس کے اندر ایمونیشن رکھا جا چکا تھا جس میں بڑی توپ کے گولے اور مشین گنوں کا بہت سارا ایمونیشن تھا۔ سٹین گنوں کی گولیوں کا ایک بکس اور کچھ گرینیڈ بھی تھے اور ٹینک پٹرول سے بھرا ہُوا تھا۔ اس کے قریب پٹرول کے بڑے بیرل (ڈرم) بھی رکھے تھے۔ کچھ بیرل خالی تھے اور کچھ بھرے ہُوئے۔ یہ ہٹائے جا رہے تھے۔ یُوسا ٹینک پر چڑھ گیا تو رُوپ چندر کے ٹروپ کے دو تین جوانوں نے بیک وقت شور مچایا۔ وہ سب یُوسا کو ٹینک سے اُترنے کو کہہ رہے تھے۔ رُوپ چندر آگے چلا گیا اور اس نے بھی اسے ٹینک سے اُترنے کو کہا۔ مگر یُوسا نے توجہ ہی نہیں دی۔ کسی نے بلند آواز سے کہا ——— "اُس کے ہاتھ میں گرینیڈ ہے" ——— دفعدار روپ چندر نے بھی دیکھا کہ یُوسا ٹینک پر چڑھ کر سیدھا ہُوا تو اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے گرینیڈ کی پن بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے نکالی۔ رُوپ چندر کی کمر کے ساتھ ریوالور تھا۔ اس کے قریب اس کا ایک جوان کھڑا تھا جس کے پاس سٹین گن تھی۔

رُوپ چندر نے اس جوان سے سٹین گن لے کر یُوسا پر فائر کیا۔ یُوسا ٹینک پر ہی دوہرا ہو گیا اور اس کے کپڑے فوراً لال سُرخ ہو گئے۔ یُوسا پیچھے یا دائیں بائیں گرنے کی بجائے ٹینک کے اندر جُھکا اور اس نے دایاں ہاتھ آگے کر کے گرینیڈ ٹینک کے اندر پھینک دیا۔ پھر وہ بائیں کو لڑھک گیا۔ سٹین گن کی پوری بوچھاڑ اس کے جسم سے پار ہو گئی تھی لیکن وہ اپنا کام کر چکا تھا۔

گرنیڈ اندر پھٹا اور اس کے بعد ٹینک کے اندر رکھے ہوئے گولے اور گرنیڈ اور دوسرا ایمونیشن پھٹا تو ایک ہزار پونڈ کے بم سے زیادہ دھماکہ ہوا۔ ٹینک کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ رُوپ چندر پہلے ہی زمین پر لیٹ گیا تھا۔ دھماکے سے شعلہ ہر طرف لپکا تو پٹرول کے بیرل پھٹنے لگے۔ ایک سیدھے سادے اور بُدھو دیہاتی نے ایسا بھیانک انتقام لیا کہ قیامت مچا دی۔ ٹینک تباہ ہو گیا۔ پٹرول کے بہت سے بیرل جل گئے اور اس کے ساتھ چار جوان مارے گئے اور سات زخمی ہُوئے۔

بھارتی ٹینک رجمنٹ کے دفعدار رُوپ چندر نے کہا کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یُوسا نے سوچ سمجھ کر یہ کارروائی کی تھی۔ رُوپ چندر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یُوسا نے کس وقت اور کہاں سے گرنیڈ چُرایا تھا اور اس نے کہاں چُھپائے رکھا تھا۔ وہ فوجی نہیں تھا۔ اسے صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ گرنیڈ سے چھلا کھینچ دو تو گرنیڈ پھٹ جاتا ہے اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ ٹینک کے اندر گولے اور پٹرول ہوتا ہے۔ اس نے اپنی عقل استعمال کی تھی اور بھارت کو کم و بیش ایک کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے عوض اس نے اپنی جان دے دی جس کی گاؤں میں کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔

پاکستان کے لیے یُوسا بہت قیمتی انسان تھا۔

اسی جنگ میں پسرور کے علاقے میں کہیں ہمارے ایک توپخانے کی پوزیشن تھی۔ توپ خانے اگلے مورچوں سے کچھ دُور پیچھے ہوتے ہیں۔ اُن کے او پی آگے ہوتے ہیں جہاں سے وہ دشمن کے اگلے مورچوں کو دیکھ کر یا اس کے توپ خانے کی پوزیشن کا اندازہ کر کے وائرلیس کے ذریعے اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیتے اور گولہ باری کراتے ہیں۔ اس توپ خانے کے ایک بیٹری کمانڈر سے ملاقات ہُوئی۔ اُس نے میری ملاقات اپنی ایک گن کے توپچیوں سے کرائی۔ اُنہوں نے ایک دیہاتی لڑکی کا واقعہ سنایا۔ چونڈہ کی جنگ عروج پر تھی۔

یہ توپ خانہ ایک گاؤں سے تھوڑی دُور پوزیشن میں تھا۔ توپیں ایک دوسری سے دُور دُور تھیں۔ ایک روز ایک نوجوان دیہاتی لڑکی پراٹھے اور سالن لے کے

ایک توپ کے توپچیوں کے پاس گئی اور چنگیر ان کے آگے رکھ دی۔ کہنے لگی کہ ان کے لیے پراٹھے لائی ہے۔ توپچیوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ نہیں راشن پانی مِل جاتا ہے۔ اس لیے وہ آئندہ توپ کے قریب نہ آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر دشمن کی گولہ باری شروع ہو جائے یا ہوائی حملہ ہو جائے۔ لڑکی کا چہرہ اُداس ہو گیا۔ وہ نوجوان تھی۔ حجاب کی وجہ سے جوان آدمیوں کے ساتھ باتیں کرنے سے جھجکتی تھی۔ وہ شاید اس لیے اُداس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی اس سے اسے روکا جا رہا تھا۔

توپچیوں نے اُس کے پراٹھے کھا لیے۔ ایک توپچی نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے ازراہِ مذاق کہا کہ لسی پیئے مُدّت ہو گئی ہے۔ انہوں نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلی گئی۔ بہت دیر گزر گئی۔ اچانک اس توپ خانے پر دشمن کے توپ خانے کی گولہ باری شروع ہو گئی۔ دشمن کے فضائی او پی نے شاید یہ پوزیشن معلوم کر لی تھی۔ اپنے توپ خانے کے او پی کو وائرلیس پر بتایا گیا کہ دشمن کے توپ خانے کی نشاندہی کرے۔ اس نے جوابی فائر آرڈر دیا۔ اِدھر سے بھی توپیں دھاڑنے لگیں۔ یہ توپ خانے کا معرکہ تھا۔ دشمن کے پاس توپ خانے کی افراط تھی۔ اِدھر کی چھ توپوں کے مقابلے میں اُدھر سے بیس توپوں کے گولے آتے تھے جو ہماری توپوں سے چالیس پچاس گز پیچھے گر رہے تھے۔ پھر گولے بکھر کر گرنے لگے۔ گرد و غبار کا یہ عالم کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ گولوں کے ٹکڑے اور پتھر زنّاٹوں سے ہر طرف اُڑ رہے تھے۔

ایک توپچی پیچھے ایک خندق میں رکھا ہُوا ایمونیشن لینے گیا۔ گولہ باری میں پیچھے جانا بے حد خطرناک تھا۔ کوئی بھی قدم آخری قدم ہو سکتا تھا۔ یہ جوان پیچھے جا رہا تھا تو دس بارہ گز دُور گرد و غبار میں اُسے ایک جھاڑی کے ساتھ ایسے نظر آیا جیسے کوئی دیہاتی لیٹا ہُوا ہے۔ توپچی نے غور سے دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا پیٹ کے بل آگے کو سرک رہا تھا۔ توپچی نے مجھے بتایا کہ ہمارے قریب آ کر کسی سویلین کا زخمی یا شہید ہو جانا ہمارے لیے شرم کا باعث تھا۔ توپچی پھٹتے گولوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوڑ کر گیا۔ وہ یہ دیکھ کر سُن ہو گیا

کہ وہ کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہ وہی لڑکی تھی جو بہت دیر پہلے ان توپچیوں کو پراٹھے کھلا گئی تھی۔ اب وہ اس طرح پیٹ کے بل رینگتی ہوئی توپ کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے آگے مٹی کی ایک ڈولی تھی جس میں لسی تھی۔ وہ ڈولی کو ہاتھوں سے آگے سرکاتی تھی اور خود بھی سرکتی تھی۔ توپچی نے اُسے غصے سے کہا — "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ مرنے کے لیے آئی ہو؟" — اس غصے میں پیار اور احترام تھا۔

پھٹتے گولوں کے دھماکوں اور زناٹوں میں لڑکی کی دبی دبی سی آواز سنائی دی — "تم میں سے کسی نے کہا تھا کہ لسی پیئے مدت ہوگئی ہے۔ تمہارے لیے لسی لائی ہوں۔"

توپچی ایمونیشن کو بھول گیا۔ اپنے فرائض کو بھول گیا۔ وہ لڑکی کے آگے بیٹھ گیا تاکہ گولہ جو سامنے سے آئے وہ اسے لگے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ گولہ جو اسے لگے گا، وہ لڑکی کے بھی پرخچے اُڑا دے گا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر رینگنے لگا اور اسے بیٹری کمانڈر کی اس خندق میں لے گیا جس کے اندر لحد کی طرح ایک اور خانہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اسے فاکس ہول کہتے ہیں۔ یہ ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ گولہ باری ختم ہونے تک لڑکی کو وہیں رکھا گیا۔ بیٹری کمانڈر نے مجھے بتایا کہ لڑکی کے چہرے پر خوف کی بجائے اطمینان اور سکون تھا۔ یہ سکون اس کامیابی کا تھا کہ اس نے گولہ باری میں اپنے بھائیوں کو لسی پہنچا دی ہے۔ اسے ایک بار پھر کہا گیا کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ اس کے چہرے کے سکون پر اُداسی چھا گئی۔ اُس نے کہا — "ایک روز ہمارے گاؤں میں تین فوجی شہیدوں کی لاشیں آئی تھیں" — یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی — "وہ بڑے خوبصورت جوان تھے۔ اتنے خوبصورت جوان مارے جاتے ہیں تو میں مرگئی تو کیا ہو جائے گا؟" — پاکستان کی اس بیٹی کو روکنا آسان نظر نہیں آتا تھا لیکن اگلی صبح اس توپ خانے کو تین میل دور ایک اور پوزیشن میں بھیج دیا گیا۔

کل کی حقیقت، آج کا افسانہ

جنگِ ستمبر کے فوراً بعد میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ — "آج کی حقیقت کل افسانہ نہ بن جائے" — اس مضمون کا لبِ لباب یہ تھا کہ جنگِ عظیم کو ختم ہوئے (۱۹۶۵ء میں) بیس سال گذر گئے ہیں کھنڈرات پر نئے شہر تعمیر ہو چکے ہیں۔ دنیا بدل گئی ہے مگر لڑنے والی قوموں نے جنگ کو قصۂ پارینہ نہیں بننے دیا۔ ان کے ادیبوں اور وقائع نگاروں کی ایک فوج ابھی تک بہادری کے کارنامے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریخ کے حوالے کر رہی ہے۔ ابھی تک واقعاتی کہانیاں اور ناول لکھے جا رہے ہیں اور ان کی فلمیں بن رہی ہیں۔ روس کے ایک اخبار نویس نے ماسکو سے تھوڑی دور لڑے جانے والے ایک معرکے کی تفصیل پورے بیس سال صرف کر کے اکٹھی کی تھی۔ اس معرکے میں اٹھائیس گمنام نیم فوجی روسی نوجوانوں نے جرمنی کے اٹھائیس ٹینکوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس میں سے صرف تین نوجوان زندہ بچے جن کے متعلق کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں ہیں۔ اس اخبار نویس نے روس کی خاک چھان ماری۔ ان اٹھائیس جاں نثاروں کا نام کسی ریکارڈ میں نہیں تھا کیونکہ وہ فوجی نہیں تھے۔ سترہ سال کی تلاش کے بعد اس اخبار نویس کو ان میں سے ایک آدمی ملا لیکن وہ دماغی لحاظ سے معذور تھا۔ اسی معرکے میں اس کا دماغ بیکار ہو گیا تھا۔ تین مزید سال گزر گئے اور اسے باقی دو آدمی مل گئے۔ ان میں سے ایک کی دونوں ٹانگیں نہیں تھیں اور دوسرا نیم پاگل ہو چکا تھا۔

اس طرح بیس سال صرف کر کے ایک اخباری وقائع نگار نے صرف ایک معرکے کی تفصیلات اکٹھی کیں اور معرکہ قلمبند کیا۔ اتنی کاوش اس نے صرف اس لیے کی تھی کہ آج کی حقیقت کل افسانہ نہ بن جائے۔ جنگوں میں انفرادی کردار کے بعض ایسے مظاہرے ہوتے ہیں جو سچے ہونے کے باوجود

افسانہ لگتے ہیں۔ بھارت کے ساتھ پاکستان نے جو جنگیں لڑی ہیں، ان میں
انفرادی شجاعت اور جذباتی اُبال کے ایسے ہی مظاہرے ہوئے ہیں جو
ناقابلِ یقین نظر آتے ہیں لیکن میں نے اپنی فوج کو اتنے قریب سے دیکھا
ہے کہ مشین گنوں کی تڑاخ تڑاخ ہی نہیں سُنی اپنے جوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں
بھی سُنی ہیں۔ میرے لیے انفرادی شجاعت کا کوئی بھی کارنامہ حیران کُن نہیں
جو سپاہی جنگ کو ذاتی لڑائی سمجھ کر لڑا کرتا ہے اس کا جسم نہیں روح لڑتی
ہے۔ مَیں تحصیل کوہاٹ کے گاؤں ڈُبی بانڈہ کے خٹک سپاہی حاضر محمد شہید
اور درگئی (مالاکنڈ ایجنسی) کے گاؤں کا ماگرا کے سپاہی محمد حسن شہید کو کبھی نہیں
بھول سکوں گا۔ بھارتی ڈویژن تابڑ توڑ حملوں سے (لاہور سیکٹر میں) بی آر بی
تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈوگرئی (جلّو موڑ) سے آگے ہمارے چند
ایک جوان رہ گئے تھے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دن بھارتی ٹینک ڈوگرئی سے
آگے والے مورچوں تک چڑھ آئے۔ جوانوں کے پاس ایمونیشن ختم ہو رہا تھا
سپاہی حاضر محمد شہید اور سپاہی محمد حسن شہید کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ انہوں
نے دیکھا کہ دشمن کے ٹینک سر پر آگئے ہیں تو وہ دونوں مورچوں سے نکل آئے۔
حاضر محمد نے ایک ٹینک کے سامنے جا کر پچاس گز سے کم فاصلے سے راکٹ لانچر
فائر کیا۔ ٹینک کی مشین گن فائر ہوئی۔ اِدھر حاضر محمد کبھی نہ اُٹھنے کے لیے گرا،
اُدھر دشمن کا ٹینک دھماکے سے پھٹ کر شعلوں کی نذر ہو گیا۔ سپاہی محمد حسن
نے صرف پندرہ گز کے فاصلے سے لانچر فائر کیا۔ ٹینک کی مشین گن نے اسے
گرایا اور اس کے راکٹ نے ٹینک کو تباہ کر دیا۔

میرے خدشے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں پاکستانیوں کا ایک
ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پاک بھارت دوستی کا پرچار کرتا پھر رہا ہے۔
کراچی کے وہ ڈائجسٹ پرچے جو ہندو دیومالائی داستانیں جنسی چاشنی کے
ساتھ طلسماتی انداز سے شائع کر کے پاکستانیوں کو مسحور کر رہے ہیں، بھارتی
عزائم کے ترجمان ہیں۔ اس گروہ اور اس کے ترجمان رسالوں نے
پاکستان کی عسکری روایات پر افسانے کا لیبل لگا دیا ہے اور دسمبر ۱۹۷۱ء کے

المیہ کو یہ لوگ اپنے مفادات کی خاطر استعمال کر رہے ہیں۔ حقیقت بہرحال
حقیقت ہوتی ہے۔ اسے ہزار جھٹلائیں، اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔

ایسا ہی ایک حقیقی کردار ضلع گجرات، تحصیل کھاریاں کے گاؤں کاس ملک
کا رہنے والا لانس نائک سید علی شہید تھا۔ مَیں اس شہید کی کہانی اس
سے پہلے سُنا چکا ہوں، لیکن وہ ادھوری تھی۔ جنگ کے پانچ سال بعد
پاک فوج کے ایک نابینا میجر سے ملاقات ہوئی۔ مَیں نے انہیں یہ کہانی
سنائی تو انہوں نے بتایا کہ وہ بھی اسی کہانی کے ایک کردار ہیں۔ چنانچہ مَیں
اس کہانی کے جس خلا کو پُر کرنے کے لیے پانچ سال پریشان رہا وہ اس
میجر نے پُر کر دیا مگر یہ میجر جس نے اپنی دونوں آنکھیں اپنی ڈیوٹی کی نذر کر دی
تھیں شاید مجھے اس کہانی کا وہ حصہ سنانے کے لیے جو مجھے معلوم نہیں
تھا اور مجھ سے وہ حصہ سننے کے لیے جو اسے معلوم نہیں تھا، زندہ تھا۔
گلبرگ لاہور کی ایک کوٹھی میں اس نے مجھے اور مَیں نے اسے کہانی سنائی تو
میں نے اسے کہا کہ مَیں اس کی بٹالین کا وہ حملہ جس میں وہ امرتسر کے قریب
جا پہنچے تھے اگلی ملاقات پر تفصیل سے سنوں گا مگر اگلی ملاقات سے پہلے
ہی ایک صبح اخبار کھولا تو ایک خبر کی سُرخی نظر آئی ــــ "گوجرانوالہ کے قریب
جیپ اور ٹرک کی ٹکر۔ پاک فوج کا میجر ذوالفقار جاں بحق ہو گیا" ــــ میں
نے خبر پڑھی۔ اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دیا کہ یہ وہ میجر ذوالفقار نہیں ہو سکتا
جس سے مجھے ملنا تھا۔ یہ اپنے دوستوں کا اور اپنے ماں باپ کا اور اپنی
جواں سال بیوی کا زُلفی نہیں ہو سکتا۔ مگر خبر بڑی صاف تھی۔ خبر میں نابینا
میجر لکھا گیا تھا۔

۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح لاہور سیکٹر میں دشمن پر جوابی حملہ کیا گیا تھا جس
میں ہماری نفری بہت تھوڑی تھی لیکن شدت ایسی کہ دشمن کے پاؤں بُری
طرح اُکھڑے اور اسے سرحد سے باہر نکال دیا گیا۔ بھارت کا مشہور جرنیل
میجر جنرل نرنجن پرشاد اسی حملے میں ایسی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں بھاگا
تھا کہ اپنی کمانڈ جیپ بمع کاغذات اور نقشے بھسین (ہمارے ایک سرحدی

گاؤں) کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اس حملے کی تفصیلات بہت طویل ہیں، میں صرف لانس نائک سید علی شہید کی کہانی تفصیل سے سناؤں گا۔ سید علی کی کمپنی دشمن کے تعاقب میں اس سمت سے سرحد سے آگے نکل گئی جہاں بی آر بی نہر دریائے راوی کے نیچے سے نکلتی ہے۔ اسے راوی سائیفن کہتے ہیں وہاں سرحد کی طرف دیکھیں تو بھارت کی رانی، طوطی اور شمشیر فوجی چوکیاں نظر آتی ہیں۔ ان سے پرے بھارت کے دو بڑے گاؤں منج اور رگکڑ ہیں جنھیں قصبے کہا جائے تو موزوں ہو گا۔ ہمارے ٹروپس کا حملہ اس قدر زوردار اور غضب ناک تھا کہ وہ بھارت کے ان دو قصبوں سے بھی آگے نکل گئے۔ وہاں سے امرتسر دس گیارہ میل دُور ہے۔ اس علاقے میں بھارت کا نمبر ۶۹ پیادہ بریگیڈ تھا۔ یہ بریگیڈ غیر منظم اور غیر فوجی طریقے سے پسپا ہُوا۔ اس بریگیڈ کا کمانڈر سکھ تھا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ اسے ایسی بیہودہ پسپائی کی پاداش میں فوج سے برطرف کر دیا گیا تھا۔

لانس نائک سید علی شہید کی کمپنی کو حکم ملا کہ دشمن کی جس پوسٹ پر اس نے قبضہ کیا ہے وہ بلوچ رجمنٹ کے حوالے کر کے واہگہ کی طرف چلی جائے۔ اس دوران کمپنی کمانڈر میجر نذیر احمد گِل شدید زخمی ہو گئے۔ انہیں پیچھے لانا ضروری ہو گیا۔ ان سے کمپنی کی کمان ایک نوجوان لیفٹیننٹ افتخار نے لے لی۔ اس کی مدد کے لیے صُوبیدار غلام رسول شہید اور صُوبیدار حکیم خان شہید تھے۔ میجر نذیر احمد گِل کو پیچھے بھیجنے کا مسئلہ تھا۔ اگر آپ راوی سائیفن پر جا کر سرحد تک کی زمین دیکھیں تو وہاں آپ کو جگہ جگہ پانی اور کھڈ نظر آئیں گے۔ ساری زمین ہاتھی گھاس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی پگڈنڈی بھی نہیں کیونکہ یہ علاقہ گزرنے کے قابل نہیں۔ میجر نذیر گِل کو اسی علاقے میں سے لانا تھا جہاں ایمبولینس نہیں جا سکتی تھی اور جہاں سے لانا تھا وہ جگہ بی آر بی سے تین میل سے زیادہ دُور تھی۔ لانس نائک سید علی شہید نے انہیں اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر پیچھے لانے کی پیش کش کی۔ سید علی کا قد چھ فٹ تھا اور وہ پہلوان اور باکسر تھا۔ ہیمر تھرو کا بھی ماہر کھلاڑی تھا۔

اس نے میجر نذیر گِل کو پیٹھ پر اُٹھا لیا اور پیچھے چل پڑا۔ وہ تازہ دم نہیں تھا۔ وہ حملے میں شریک تھا۔ اس کے پاس مشین گن تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ اس نے اتنا زیادہ ایمونیشن اُٹھا لیا تھا جو دو آدمی مل کر بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کی مشین گن نے پلاٹون کی پیش قدمی میں بہت مدد دی تھی۔ وہ بہت تھکا ہُوا تھا۔ سستایا بھی نہ تھا کہ اپنے کمپنی کمانڈر کو اُٹھا کر چل پڑا۔ راستہ نہ صرف لمبا تھا بلکہ کھڈوں، سیم کے پانی اور ہاتھی گھاس کی وجہ سے دشوار گزار بھی تھا۔ اس نے میجر نذیر گِل کو اُٹھائے ہوئے ایک میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ میجر نذیر گِل نے اسے ذرا سستانے کو روک لیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ سید علی کے ہونٹ پیاس سے خشک ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسے کہا کہ جاؤ کہیں سے پانی ڈھونڈ کر پی لو۔ سید علی غالباً اپنے کمپنی کمانڈر کو اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پانی پینے سے انکار کر دیا۔ میجر نذیر گِل نے اسے پانی پلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسے کہا — "مجھے پیاس لگی ہے، میرے لیے پانی ڈھونڈ لاؤ۔"

شام کا اندھیرا گہرا ہوتا چلا رہا تھا۔ سید علی اپنے زخمی کمپنی کمانڈر کے لیے پانی ڈھونڈنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میجر نذیر گِل کو یہ احساس ہُوا کہ وہ اپنے جسم کا بوجھ ایک ایسے جوان کے کندھے پر ڈالے ہوئے ہے جو مسلسل تین دن اور تین راتوں سے لڑ رہا ہے اور جس نے کئی میل پیش قدمی بھی کی ہے۔ چنانچہ سید علی کو اپنے بوجھ سے آزاد کرنے کے لیے اُنہوں نے بی آر بی کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ وہ اُٹھ کر چلنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ اُن کا عزم تھا کہ بی آر بی تک پہنچ جائیں گے لیکن ان کی یہ کوشش ان کی جان لے سکتی تھی کیونکہ زخموں سے خون بہ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سید علی پانی لے کے آئے گا اور انہیں وہاں نہ پا کر اپنی کمپنی میں واپس چلا جائے گا۔

سید علی خاصی دیر بعد واپس آیا مگر وہاں میجر نذیر گِل نہیں تھے۔ وہ

ایک پاؤں اور ایک ہاتھ کے بل رینگتے اور چلتے کچھ دُور نکل گئے تھے۔
ان کے سامنے دو میل سے زیادہ فاصلہ تھا جو اس حال میں طے کرنا
ممکن نہیں تھا۔ سید علی اپنی کمپنی میں جانے کی بجائے میجر نذیر گل کو
کھڈوں، دلدل، ہاتھی گھاس اور سرکنڈوں میں ڈھونڈنے لگا۔ وہ
"میجر صاحب"، "میجر گل صاحب" پکار رہا تھا۔ اسے کوئی جواب نہیں مل
رہا تھا۔ وہ رات بھر مارا مارا پھرتا رہا، اسے اپنا زخمی کمپنی کمانڈر نہ ملا۔ سحر
کے وقت اس کی کمپنی کی ایک گشتی پارٹی نے اسے دیکھ لیا اور اسے کمپنی
میں واپس لے گئی۔ وہاں سے اس کی کمپنی ڈوگرئی سے ڈیڑھ میل آگے
مورچہ بند ہوئی۔ لانس نائیک سید علی شہید پر خاموشی طاری ہو گئی تھی
وہ اگر بولتا تھا تو اتنا ہی کہتا تھا — "میں نے کمپنی کمانڈر کو پیاسا مار دیا
ہے۔ اس نے مجھ سے پانی مانگا تھا" — اسے بتایا گیا کہ میجر نذیر گل
ہسپتال میں پہنچ گئے تھے اور زندہ ہیں مگر سید علی کو یقین نہیں آرہا تھا۔
اسے معلوم تھا کہ میجر نذیر گل اس قدر زیادہ زخمی تھے کہ خود چل ہی نہیں
سکتے تھے۔ وہ پیاسے شہید ہو گئے ہیں۔

آخر ۱۶/۱۵ ستمبر کی درمیانی رات سید علی واہگہ کے سامنے دشمن کا
ایک حملہ روکتے ہوئے شہید ہو گیا۔ اس کے مورچے کے ساتھیوں کا بیان
ہے کہ میجر نذیر گل کے زخمی ہونے کے بعد اپنی شہادت تک اس نے پانی
نہیں پیا تھا۔ بولتا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی اتنا ہی کہتا تھا — "میں نے
اپنے کمپنی کمانڈر کو پیاسا مار دیا ہے" — اور وہ خود پیاسا شہید ہو گیا۔

مجھے لانس نائیک سید علی شہید کی کہانی تو معلوم ہو گئی لیکن یہ معلوم نہ ہو
سکا کہ میجر نذیر گل وہاں سے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ان سے میری ملاقات
نہ ہو سکی۔ پھر ان کی بٹالین کہیں دُور چلی گئی اور پانچ سال گزر گئے۔ ایک روز
ایک دوست نے مجھے بتایا کہ گلبرگ میں ایک میجر ذوالفقار رہتے ہیں جن کی
دونوں آنکھیں نکل گئی ہیں۔ وہ جنگِ ستمبر میں امرتسر کے قریب پہنچ گئے تھے
میں ان سے ملا۔ چھریرے جسم کے اس جوان سال میجر کو اس معذوری کی

حالت میں دیکھ کر بہت ہی افسوس ہوا۔ وہ جنگ کے وقت کیپٹن تھے اور
اس بلوچ رجمنٹ میں تھے جس نے ۸ ستمبر کی صبح دشمن پر جوابی حملہ کیا تھا۔ انہوں
نے بتایا کہ ان کی کمپنی نے بھارت کے قصبے گکڑ پر قبضہ کیا تھا۔ اس قصبے کی
جامع مسجد کا گنبد بہت اونچا تھا۔ میجر ذوالفقار نے بتایا کہ ان کا ایک جوان
اس گنبد پر چڑھ کر اذان دیا کرتا تھا اور وہ خود توپ خانے کے ایک
افسر کے ساتھ اسی گنبد پر چڑھ کر اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیا کرتے
اور دشمن پر گولہ باری کراتے تھے۔ گنبد اتنا اونچا تھا کہ دُور دُور تک کا علاقہ
دیکھا جا سکتا تھا۔ حد یہ کہ امرتسر کے کلس بھی نظر آجاتے تھے مگر وہاں
سے اپنے تمام ٹروپس کو پیچھے ہٹا لیا گیا تھا کیونکہ چونڈہ کی ٹینکوں کی جنگ
میں ٹینکوں کی ضرورت تھی۔ لاہور سیکٹر سے ٹینکوں کی خاصی تعداد چونڈہ
بھیج دی گئی تھی۔ کھیم کرن سیکٹر سے بھی ٹینک چونڈہ بھیجے گئے تھے۔ ٹینکوں
کی مدد کے بغیر دشمن کے علاقے میں اتنی دُور اندر رہنا خطرناک تھا۔ چنانچہ
بکتر بند قوت کی کمی کی وجہ سے مزید جارحیت ترک کر کے دفاع کو مضبوط کیا
گیا جس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ دشمن کا علاقہ چھوڑ کر مورچہ بندی بی آر بی پر
کر لی گئی۔

میجر ذوالفقار نے بتایا کہ جس روز ان کی بٹالین نے جوابی حملہ کیا اور
سرحد سے آگے نکل گئی، اس سے اگلی رات وہ توپ خانے کے ایک کیپٹن
کے ساتھ راوی سائیفن کی طرف سے سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ راستے
میں انہیں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ رک گئے۔ یہ کسی زخمی کی
آواز تھی جو ہاتھی گھاس میں کہیں پڑا تھا۔ میجر ذوالفقار نے پوچھا "کون ہو؟"
— زخمی نے مری سی آواز میں جواب دیا — "میجر گل ہوں" — گل سکھوں
کی بھی ایک ذات ہے۔ اس ذات کے سکھ اپنے نام کے ساتھ گل بھی لکھتے
ہیں — "میجر گل" سن کر توپ خانے کے کیپٹن نے کہا کہ یہ کوئی سکھ ہے،
اسے اٹھا کر پیچھے لے جاتے ہیں۔ میجر ذوالفقار نے کہا — "کہاں اٹھاتے
پھریں گے ریوالور کی ایک گولی سر میں مار کر اسے ختم کر دیتے ہیں" — انہوں

نے ریوالور نکال لیا۔ میجر گل نے ان کی تجویز سُن لی تھی۔ اُنہوں نے ذرا اُونچی آواز سے کہا ـــ "مَیں سِکھ نہیں، سولہ پنجاب کا میجر نذیر گل ہُوں"۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میجر نذیر گل نے لانس نائیک سَید علی کو پانی لانے کے لیے بھیج دیا اور خود رینگنا شروع کر دیا تھا مگر وہ تھوڑی ہی دُور جا کر نڈھال ہو گئے تھے۔ اتفاق سے میجر ذوالفقار اور توپ خانے کے کیپٹن کا اِدھر سے گزر ہُوا۔ انہوں نے میجر نذیر گل کو اُٹھا لیا اور دو میل پیچھے بی آر بی تک پہنچا دیا جہاں سے ایمبولینس پر انہیں ہسپتال بھیج دیا گیا۔ میجر ذوالفقار نے جب یہ واقعہ سنایا تو مجھے اس سوال کا جواب مِل گیا کہ میجر نذیر گل پیچھے کس طرح پہنچے تھے۔ سَید علی انہیں رات بھر تلاش کرتا رہا تھا۔ میجر ذوالفقار کو معلوم نہیں تھا کہ میجر نذیر گل زخمی حالت میں وہاں کیوں پڑے تھے۔ اس وقت تک میجر گل کی حالت بگڑ چکی تھی۔ مَیں نے میجر ذوالفقار کو بتایا کہ وہاں وہ کس طرح پہنچے اور کیوں پڑے تھے۔ اس طرح ایک کہانی پانچ سال بعد مکمل ہُوئی۔

جنگ کے ایک سال بعد میجر ذوالفقار کو کمانڈو بٹالین میں بھیج دیا گیا ایک روز وہ اپنے کمانڈو جوانوں کو دشمن کا ہوائی اڈہ تباہ کرنے کی ٹریننگ دے رہے تھے۔ ان کے پاس ڈائنامیٹ (بارُود) رکھا تھا۔ اُنہیں کچھ پتہ نہیں کہ یہ ڈائنامیٹ کس طرح پھٹ گیا۔ اچانک دھماکہ ہُوا جس میں کچھ جوان جاں بحق ہو گئے۔ میجر ذوالفقار کے جسم پر چھتیس زخم آئے مگر سب سے خوفناک زخم آنکھوں کا تھا۔ ان کی دونوں آنکھیں نکل گئی تھیں اور وہ معذور ہو کر گھر آ گئے۔ اس جوانی کی عمر میں بینائی سے محروم ہو جانا معمولی حادثہ نہیں تھا مگر ابھی ایک اور حادثہ باقی تھا۔ وہ اپنی ذاتی جیپ پر پنشن لینے کے لیے راولپنڈی گئے۔ رات کو واپس آ رہے تھے۔ راستے میں سڑک پر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور کو ٹرک نظر نہ آیا۔ جیپ پُوری رفتار سے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ڈرائیور زخمی ہو گیا لیکن میجر ذوالفقار معذوری کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔

پاک فوج کا یہ خوبرُو اور پُھرتیلا میجر مجھے اکثر یاد آتا ہے اور اس کے ساتھ مجھے بھارت کا قصبہ گنگڑ بھی یاد آتا ہے جس کی جامع مسجد کے گنبد پر کھڑے ہو کر بلوچ رجمنٹ کے جوان اذان اور میجر ذوالفقار فائر آرڈر دیا کرتے تھے۔ اور مَیں اس سوچ میں کھو جایا کرتا ہُوں کہ پاکستانیوں کی اذانیں گنگڑ سے آگے امرتسر سے بھی آگے پہنچائی جا سکتی تھیں۔ اب بھی پہنچائی جا سکتی ہیں۔

لیپا میں کیا ہوا تھا

پاکستان اور بھارت کے درمیان متعدد میدانوں میں جنگیں لڑی جا چکی ہیں جن میں بڑی جنگیں بھی شامل ہیں اور وسیع پیمانے پر سرحدی جھڑپیں بھی، لیکن لیپا وادی کا جو معرکہ ۴ مئی (۱۹۷۲ء) کی رات سے ۵ مئی کی شام تک لڑا گیا، اسے بڑی جنگوں سے بھی زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے کیونکہ بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے اس معرکے کو سیاسی اہمیت دے کر اس کا رشتہ شملہ کانفرنس سے ملا دیا ہے۔ اتفاق سے یہ معرکہ اس وقت لڑا گیا تھا جب دونوں ملکوں کے سربراہوں نے شملہ کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بھارتی اخباروں اور آل انڈیا ریڈیو نے بھارتی اور پاکستانی عوام کو اور ساری دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ صدر بھٹو اور جنرل ٹکا خان نے اس مقصد کے تحت لیپا وادی میں بھارت کی پوسٹوں پر حملہ کرایا ہے کہ بھارتی لیڈروں پر شملہ کانفرنس سے پہلے یہ رعب جمایا جائے کہ پاک فوج شکست کھا کر بھی لڑ سکتی ہے اور اپنے کھوتے ہوئے علاقے مذاکرات کی بجائے لڑ کر واپس لے سکتی ہے۔

بھارت کے سیاسی لیڈروں نے تو شملہ کانفرنس کے ضمن میں عالمی رائے اپنے حق میں کرنے کے لیے لیپا وادی کی جھڑپ کو بہت اہمیت دی ہے، لیکن بھارت کے فوجی لیڈروں نے اسے اس بنا پر بہت اہمیت دی ہے کہ آزاد کشمیر فورسز کے مٹھی بھر جوانوں نے ساڑھے نو ہزار فٹ بلند ایسے پہاڑ پر جس کی ڈھلان تقریباً عمودی تھی اور جس کی بالکل عمودی چٹانیں CLIFFS بھی تھیں، چڑھ کر ایسی دو کمپنیوں پر حملہ کیا اور ان سے یہ سارے کا سارا پہاڑ چھینا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر بنکروں میں

میں مورچہ بند تھیں۔ فنِ حرب و ضرب کے ماہرین اور جنگ کے مبصروں کی نگاہ میں یہ کامیابی ایک معجزہ ہے ـــــ اور ہمارے لیے یعنی پاکستان کے عوام کے لیے یہ معرکہ اس لیے بہت اہم ہے کہ جب عوام کے دلوں میں سقوطِ مشرقی پاکستان اور مغربی محاذ کی فائر بندی نے شکست خوردگی کا انتہائی تلخ احساس اور بڑی ہی بے رحم افسردگی پیدا کر دی تھی، فوج نے عوام پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ شکست کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے، فوج ابھی نہیں ہاری اور فوج اب بھی ایک اور دس کے مقابلے میں پوری اُتر سکتی ہے۔ لیپا وادی کے معرکے نے قوم کے ضمیر سے بہت سا بوجھ اتار دیا ہے اور قوم سر اٹھا کر یہ کہہ سکتی ہے کہ ہماری فوج زندہ و پائندہ ہے۔

اس معرکے کا پس منظر اور تفصیلات سنانے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے پس منظر میں نہ صدر بھٹو کا ہاتھ تھا، نہ جنرل ٹکا خان کا۔ بھارت کے مشہور اخبار "امرتکا بازار پتریکا" کی ۱۹ مئی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں بھارت کے سابق ہائی کمشنر سی۔ سی۔ ڈیسائی کا یہ تجزیہ محض بے بنیاد ہے کہ لیپا وادی کے حملے کا پلان جنرل ٹکا خان نے بنایا تھا اور مقصد یہ تھا کہ شملہ مذاکرات پر پاک فوج کا اثر ڈالا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ پنجابیوں کے ٹوٹے ہوئے مورال کو سنبھالا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر بھٹو اور جنرل ٹکا خان کو اس حملے کی سرکاری اطلاع اُس وقت دی گئی تھی جب حملہ شروع ہو چکا تھا۔ اطلاع میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ بھارتیوں نے لیپا وادی میں ہماری ایک گھری ہوئی پوسٹ پر حملہ کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ سیکٹر کمانڈر میجر جنرل عبدالمجید ملک کے لیے فوری طور پر جوابی کارروائی لازمی ہو گئی تھی۔ جنرل مجید ملک بالائی کمان کو اطلاع دینے اور جوابی کارروائی کی منظوری لینے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، نہ ضائع کرنے کے لیے کوئی وقت تھا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت نامساعد حالات میں اور بہت ہی کم نفری سے جوابی کارروائی کا حکم دے دیا۔ یہ ایک انتہائی پُرخطر فیصلہ تھا جس کی تمام تر ذمہ داری جنرل عبدالمجید ملک نے اپنے کندھوں پر لی تھی۔

جوابی کارروائی (یا بھارتیوں کی زبان میں حملے) کا پلان آزاد کشمیر فورسز کے ایک بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت دو بار کا تھا

جس پر جنرل مجید ملک نے نہایت عجلت میں نظرِ ثانی کر کے منظوری دی تھی۔ معرکے کی تفصیل سنانے سے پہلے یہ پیشِ نظر رکھیے کہ لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید کفن کا سر والا حصہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے جوانوں کو حملے کی آخری ہدایات دیتے وقت کفن سر سے باندھ لیا تھا۔ وہ اسی معرکے میں شہید ہوئے اور انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا۔

سب سے پہلے وہ زمین دیکھیے جہاں یہ جنگ ہوئی تھی۔ لیپا وادی ایک وسیع اور عریض خطۂ کوہ ہے جس کی سطح سمندر سے اوسط بلندی پانچ ہزار فٹ اور پہاڑوں کی انتہائی بلندی بارہ ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ جہلم سے راولپنڈی کی طرف جاتے ہوئے دائیں طرف دیکھیں تو آپ کو بہت دُور کشمیر کا سلسلۂ کوہ نظر آئے گا۔ اس میں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ چوٹیاں لیپا وادی کی فصیل ہیں۔ انہیں شمسابری رینج کہتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء کی فائر بندی لائن نے لیپا وادی کے راستے کاٹ دیئے تھے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے جو راستہ بنایا گیا ہے وہ گاڑی کے لیے انتہائی دشوار اور خطرناک راستہ ہے۔ مظفر آباد سے سرینگر روڈ دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ بل کھاتی ننبلی پل تک لے جاتی ہے جہاں سے گاڑیاں دریا پار کرتی ہیں۔ آگے ریشیاں گاؤں آتا ہے جہاں سے لیپا وادی کا کچا اور پُرخطر راستہ شروع ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ راستہ دو ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ ہزار فٹ کی بلندی تک جاتا ہے۔ وہاں سے پھر نیچے جاتا ہے اور پانچ ہزار فٹ تک پہنچتا ہے جو لیپا وادی کی اوسط بلندی ہے لیکن ان دو تین فقروں سے آپ لیپا وادی کی تصویر ذہن میں نہیں لا سکتے نہ راستے کے خطرات کو سمجھ سکتے ہیں۔ صحیح تصویر وہاں جا کر ہی دیکھی جا سکتی ہے، تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ راستہ اُوپر یا نیچے جاتا ہے اور آپ کسی بھی پہاڑ پر سیدھے نہیں چڑھتے۔ دیوار کی طرح سیدھے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ زگ زیگ راستہ کاٹا گیا ہے۔ ۵/۴ مئی ۱۹۷۲ء کے معرکے تک یہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ گاڑیوں کے پہیے راستے کے کنارے پر چلتے تھے۔ اس کے بعد فوج نے راستے کو کشادہ کر دیا ہے۔ پھر بھی دو گاڑیاں اکٹھی نہیں

گذر سکتیں۔

بعض جگہوں پر راستہ سامنے والے پہاڑ پر جاتا نظر آتا ہے جو آپ سے بمشکل پانچ سو گز دُور ہے مگر اُس تک آپ اڑھائی تین میل کا سفر طے کر کے پہنچتے ہیں کیونکہ نیچے چند گز چوڑی ندی ہے جسے عبور کرنا ہے اس کے لیے آپ کو ڈیڑھ ایک میل نیچے اور ندی پار کر کے ڈیڑھ ایک میل اُوپر جانا پڑے گا۔ راستے کے ایک طرف تو آپ کو پہاڑ نظر آتا ہے اور دوسری طرف دیکھیں تو بلندی آپ کو ڈرا دیتی ہے۔ اپنے آپ کو آپ کئی ہزار فٹ اُونچا اُڑتا محسوس کریں گے۔ وہاں سے لڑھک کر دنیا کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے کے لیے گاڑی چلانے میں ہلکی سی لغزش کی ضرورت ہے۔ موڑ ایسے ہیں کہ آپ موڑ کاٹتے ہیں تو جس راستے سے آپ آئے ہیں وہ متوازی نظر آئے گا۔ ہر موڑ سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور یہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔ چڑھائی کا زاویہ ایسا ہے کہ گیئر بدلتے بدلتے گاڑی رُک جاتی ہے۔ ذرا سی بھُول ہو جائے تو گاڑی پیچھے کو چل پڑتی ہے اور چند ہزار فٹ بلندی کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ گیئر بدلنے اور بریک لگانے میں ذرا سی سُستی آپ کو دُور نیچے پھینک سکتی ہے۔

پہاڑ دیودار اور چیل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ جنگی لحاظ سے یہ جنگل فائدہ مند بھی ہے اور نقصان دِہ بھی۔ دشمن کنوائے یا اکیلی گاڑی کو گھات لگا کر تباہ کر سکتا ہے۔ گوریلا اپریشن کے لیے یہ علاقہ مثالی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی لڑائی صرف پہاڑی نہیں بلکہ یہ مؤنٹین وارفیئر بھی ہے اور جنگل وارفیئر بھی۔

اس بے حد تکلیف دِہ اور پُر خطر سفر کے بعد آپ لیپا وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں ندیوں کا جلترنگ اور نیلا پانی آپ کی تھکن دُور کر دیتا ہے۔ وہاں مکئی اور چاول کی ہری بھری کھیتیاں نظر آتی ہیں۔ ان پر اخروٹ کے درختوں نے سایہ کر رکھا ہے اور اس جنت نظیر خطّے کو آٹھ سے دس گیارہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں نے نرغے میں لے رکھا ہے۔ پہاڑوں کے دامن سے دیودار کے پیڑ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے دُور اُوپر چوٹیوں تک چلے گئے ہیں۔ وہاں پتھروں سے بھی

پانی رِستا ہے۔ پہاڑ ایک دوسرے سے متوازی بھی ہیں اور گھوم پھر کر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے بھی ہیں۔ ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر پوسٹیں بنی ہوئی ہیں یعنی فوجیں چوٹیوں پر مورچہ بند ہیں۔ لہٰذا وہاں لڑائیاں نیچے نہیں بلکہ پہاڑوں کے اُوپر ہوتی ہیں۔ یعنی کسی پہاڑ کی پوسٹ پر حملہ کرنا ہو تو دستوں کو پہاڑ پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اُوپر سے دشمن اگر صرف پتھر ہی لڑھکانا شروع کر دے تو حملہ آوروں کو ختم کر سکتا ہے۔

اب یہ تصور کیجیے کہ دسمبر میں جب یہاں جنگ ہوئی تھی تو وہاں برف جمی ہوئی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے دامن تک پہاڑ برف تلے دبے ہوئے تھے۔ کھڈ نالے برف سے ہموار ہو گئے تھے اور اس خطّے کے خدوخال کو برف نے چھپا رکھا تھا۔ رگوں میں خون منجمد کرنے والی یخ ٹھنڈ میں جنگ لڑی گئی تھی اور اس حالت میں لڑی گئی تھی کہ ہماری فوج گرم وردی سے محروم تھی۔ اس کے برعکس دشمن کی فوج نقطۂ انجماد سے کئی درجے کم درجۂ حرارت کے عین مطابق ملبوس تھی۔ اپنی نفری کا یہ عالم تھا کہ لیپا وادی میں ہماری صرف ایک کمپنی ریگولر فورس تھی۔ چار کمپنیاں سکاؤٹس کی اور ایک مجاہد کمپنی تھی۔ پیشِ نظر رکھیے کہ سکاؤٹس اور مجاہد ریگولر فورس کے جوانوں کی طرح تربیت یافتہ نہیں ہوتے نہ فوج کی طرح لڑ سکتے ہیں۔ وہ فوج کو مدد دے سکتے ہیں۔ اس قسم کی نیم تربیت یافتہ کمپنیوں اور ایک ریگولر کمپنی کی ذمہ داری میں کم و بیش سترہ میل کا علاقہ تھا اور یہ علاقہ میدانی نہیں، بلند پہاڑوں کا علاقہ تھا۔

یہ تو نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے اور کہہ بھی دیا گیا ہے کہ ہماری فوج اب لڑنے کے قابل رہی ہی نہیں لیکن اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دیتا کہ ہماری فوج کی کمی کا ذمہ دار کون ہے؟ ہمارے پاس فوج اتنی کم کیوں تھی کہ دشمن کے مؤنٹین بریگیڈوں کے حملے روکنے کے لیے ہم نے سکاؤٹس اور مجاہد آگے کیے؟ اور پھر کسی سے یہ سوال بھی پوچھیے کہ ایک تو نفری کم اور وہ بھی نیم تربیت یافتہ اور انہیں ہم نے ٹھنڈی وردی میں برف پر لڑنے کے لیے بھیجا! کیوں؟ اس کی ذمہ دار فوج تو نہیں تھی۔ دس کو دو سَو کے مقابلے میں بھیجا تو وہ نعرے لگاتے

چلے گئے ـــــ فوج کے اس جذبۂ ایثار کی تعریف کیوں نہیں کی جاتی؟

لیپا کا اصل جھگڑا

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام دشمن نے ٹیٹوال کی سمت سے حملہ کیا۔ ساڑھے سات ہزار فٹ بلند پہاڑی پر جنگ ہوئی۔ دشمن نے پوری بٹالین سے حملہ کیا، جسے صرف ایک کمپنی نے روکا۔ کمپنی کمانڈر میجر عزیز شہید ہو گئے۔ دشمن نے دوسرا حملہ سکھ رجمنٹ سے ایک اور بلند پہاڑ تُوت مار گلی سے کیا۔ یہاں اپنے سکاؤٹس تھے جن کی نفری کم تھی اور وہ تربیت یافتہ سپاہی نہیں تھے۔ وہ سکھ رجمنٹ کے سامنے جم نہ سکے۔ ۷ دسمبر کے روز آزاد کشمیر کی ایک پوری بٹالین آ گئی۔ دشمن تمام وادی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وادی اور پہاڑ میدانِ جنگ بنے رہے اور فائر بندی ہو گئی۔ فائر بندی ایسے موقعہ پر ہوئی کہ ہماری ایک پوزیشن بیرو والی ناڑ دشمن کے گھیرے میں رہ گئی۔ وہاں ہماری صرف ایک کمپنی تھی جس کے کمپنی کمانڈر میجر حبیب تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دشمن ان کی پوسٹ کے اردگرد قابض ہو گیا ہے اور ان کے نکلنے کے اور کمک اور سپلائی کے راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال ہتھیار ڈالنے تک نوبت پہنچا سکتی ہے۔ اس کے باوجود میجر حبیب نے وہ پوزیشن نہ چھوڑی اور گھیرے میں لڑتے رہے اور فائر بندی ہو گئی۔

فائر بندی کی رات شمال میں ہمارے دستوں نے آگے بڑھ کر مقبوضہ کشمیر کے دو پہاڑوں گٹی پھترا اور گرسی ڈنہ پر قبضہ کر لیا۔ اسے جموہا بلج کہتے ہیں۔ اس سے دشمن کو یہ نقصان ہُوا کہ اس کا جو بریگیڈ لیپا وادی میں تھا دوسرے بریگیڈوں سے کٹ گیا اور اس بریگیڈ کو جس قریبی راستے سے سپلائی جاتی تھی وہ ہمارے قبضے میں آ گیا۔ اب اس بریگیڈ کو کمک اور سپلائی پہنچانے کے لیے دشمن کو چار پانچ روز کی ایسی مسافت طے کرنی پڑتی ہے جس کی راہ میں ہزار ہا فٹ بلند اور برف پوش پہاڑ حائل ہیں۔ اُس کے ٹیلی فون کے تار بھی اسی راستے سے گزرتے تھے۔ وہ بھی کٹ گئے۔

اپریل ۱۹۷۲ء کے آغاز میں بھارتی کمانڈروں نے ہمارے کمانڈروں سے کہا کہ انہیں جموہا بلج میں سے سپلائی گزرنے کا راستہ دیا جائے۔ یعنی جو علاقہ آزاد کشمیر کے دستوں نے دشمن سے لے لیا تھا اس میں سے وہ اپنے اُس بریگیڈ کو ایمونیشن راشن اور کمک پہنچانے کے لیے راستہ مانگ رہا تھا جو اُس نے لیپا وادی پر قبضہ کرنے کے لیے مورچہ بند کر رکھا تھا۔ ہمارے کمانڈروں نے راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر دشمن نے صرف ٹیلی فون تار وہاں سے گزارنے کی اجازت مانگی۔ وہ بھی نہ دی گئی۔ دشمن اپنی ذہنیت کے مطابق اوچھی حرکت پر اُتر آیا۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء کے روز بھارتیوں نے جموہا بلج کے دونوں اہم مقامات ' گرسی ڈنہ اور گٹی پھترا پر توپخانے کی شدید گولا باری شروع کر دی اور اس کے سائے میں ہماری پوزیشنوں پر حملہ کر دیا۔ یہ فائر بندی کی معمولی قسم کی خلاف ورزی یا چھوٹی سی سرحدی جھڑپ نہیں تھی۔ دشمن نے مکمل جنگی اہتمام سے حملہ کیا تھا۔ وہاں آزاد کشمیر فورس کی صرف ایک ایک پلاٹون مورچہ بند تھی جن پر دشمن نے پوری پوری کمپنی سے حملہ کیا۔ یاد رکھیے کہ پلاٹون کمپنی کا تیسرا حصہ ہوتی ہے۔ ہمارے جانبازوں نے تین گنا طاقتور دشمن کا مقابلہ کیا۔ گولا باری کا بھی سامنا کیا اور دشمن کا حملہ اس حال میں ناکام کیا کہ دشمن کو ایک انچ زمین بھی حاصل نہ کرنے دی اور دشمن ایک سو بیس لاشیں ہماری پوزیشنوں کے سامنے چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔ اسے لاشیں اُٹھانے کا موقع نہ دیا گیا۔ یہ وہ لاشیں تھیں جو سامنے پڑی نظر آتی تھیں۔ پہاڑوں سے جو لڑھک گئی تھیں وہ الگ تھیں۔ یہ ایک سو بیس لاشیں وہیں پڑی رہیں اور برف تلے دب گئیں۔

دشمن نے اس حملے سے بڑھ کر ایک اور اوچھی حرکت کی جو انتقامی کارروائی تھی۔ لیپا وادی میں ہماری ایک پوسٹ بیرو والی ناڑ، فائر بندی کے وقت اس طرح گھیرے میں آ گئی تھی کہ چاروں طرف کے پہاڑوں پر دشمن کی پوسٹیں تھیں۔ بیرو والی ناڑ تک سپلائی وغیرہ پہنچانے کے لیے صرف ایک راستہ ہے جو دراصل ایک ندی ہے۔ یہ راستہ آزاد کشمیر فورس کی تحویل میں تھا اور ادھر سے بیرو والی ناڑ کو باقاعدگی سے سپلائی جاری تھی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو دشمن نے جموہا بلج پر حملہ کر کے آزاد کشمیر کے دستوں سے

بُری طرح شکست کھائی تو لیپا وادی میں اس نے ہماری بیرو والی ناڑ پوسٹ کی سپلائی کا راستہ بند کر دیا۔ ندی کے دائیں بائیں کے پہاڑوں پر دشمن قابض تھا۔

دو دن تک پوسٹ تک نہ راشن پہنچ سکا نہ ایمونیشن۔ ۲۹ اپریل ۱۹۷۲ء کے روز دونوں طرف کے مقامی کمانڈروں نے میٹنگ کی۔ اُدھر سے نمبر ۹ سکھ رجمنٹ کا ہندو کمانڈنگ آفیسر کرنل چنگیاپا آیا۔ اِدھر سے کرنل حق نواز کیانی شہید اور آزاد کشمیر کی اِس بٹالین کے ایک کمپنی کمانڈر میجر اشتیاق احمد راجہ گئے۔ بھارتی کرنل نے وہی مطالبہ دہرایا کہ اُنہیں جموہا بلج میں سے سپلائی گزارنے کا راستہ دیا جائے مگر اب اس مطالبے کا رنگ درخواست والا نہیں بلکہ دھمکی آمیز تھا۔ دھمکی یہ تھی کہ اگر اُنہیں اُدھر سے راستہ نہ دیا گیا تو وہ ہمیں بیرُو والی ناڑ تک سپلائی نہیں پہنچانے دیں گے حالانکہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء سے اس پوسٹ کو اسی راستے سے سپلائی جاری تھی۔ کرنل کیانی شہید نے بھارتی کرنل سے کہا کہ وہ اپنے سینئر کمانڈر سے بات کریں گے۔ بھارتی کرنل نے اتنی سی رعایت دی کہ راشن بھیج دو، ایمونیشن نہیں جا سکتا۔

راشن تو جانے لگا لیکن بھارتی افسروں اور جوانوں نے یہ روّیہ اختیار کر لیا کہ انہوں نے راستے میں باقاعدہ چیک پوسٹ بنا لی اور خچروں پر لدے ہوئے سامان کی تلاشی لینے لگے۔ وہ اس حد تک پریشان کرنے لگے کہ کچھ راشن اپنے لیے نکال لیتے تھے۔

ہماری پوزیشنوں کے سامنے وہ برف پوش پہاڑ ہیں جو دُور دُور سے نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک مقام تُوت مار گلی ہے۔ دیکھا گیا کہ بھارت کی ایک پوری بٹالین وہاں سے نیچے آ رہی تھی۔ وہاں کوئی درخت یا سبزہ نہیں۔ برف جمی رہتی ہے اس لیے ایک قطار میں اُترتے ہوئے جوان صاف نظر آ رہے تھے۔ اس سے دشمن کے عزائم کا پتہ چلتا تھا۔ وہ وادی میں یقیناً جنگی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

مردِ مومن نے چیلنج قبول کر لیا

۳ مئی ۱۹۷۲ء کے ایک روز مقامی کمانڈروں کی ایک اور میٹنگ ہوئی۔

اِدھر سے لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید، میجر اشتیاق احمد راجہ اور میجر یار افضل آفریدی گئے۔ اُدھر سے کرنل چنگیاپا آیا۔ کرنل چنگیاپا نے کہا کہ اس کے بریگیڈ کمانڈر نے کہا ہے کہ آزاد کشمیر فورس بیرُو والی ناڑ خالی کر دے یا جموہا بلج سے گٹی پھترا والی پوزیشن چھوڑ دے ورنہ بیرُو والی ناڑ کی سپلائی کا راستہ نہیں کھولا جائے گا۔ کرنل حق نواز کیانی دشمن کی نیت کو بھانپ گئے کہ ہندو انہیں چیلنج کر رہا ہے۔ انہوں نے کرنل چنگیاپا سے کہا —— "ہم خود راستہ کھول لیں گے"۔ اور چیلنج قبول کر لیا۔

کرنل چنگیاپا بولا —— "میری طرف سے فائر میں پہل نہیں ہو گی"۔

اس ہندو کرنل کی یہ یقین دہانی ایک فریب تھا۔ اسی رات (۴/۳ مئی ۱۹۷۲ء) کی درمیانی رات گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بھارتیوں نے لیپا وادی میں ہماری تمام اگلی پوسٹوں پر توپخانے کی گولا باری شروع کر دی۔ اس میں مارٹر گنوں کی گولا باری بھی شامل تھی۔ گولا باری شدید تھی جو بڑے پیمانے کے حملے سے پہلے کی جاتی ہے۔ رات گیارہ پچپن پر گولا باری شروع ہوئی۔ صبح چار بجے دشمن نے پیشقدمی شروع کی اور پوری بٹالین (نمبر ۴ مہار رجمنٹ) سے بیرُو والی ناڑ پر دو طرفی حملہ کر دیا۔ یہ وہ پوسٹ ہے جو گھیرے میں تھی۔ وہاں پہلے آزاد کشمیر فورس کے میجر حبیب کمپنی کمانڈر تھے اور حملے والی رات ایک نوجوان افسر کیپٹن جاوید انور کمپنی کمانڈر تھے۔ وہاں پہلے سول آرمڈ فورسز یعنی سکاؤٹس کی ایک کمپنی تھی جو ریگولر فورس کی طرح تربیت یافتہ نہیں ہوتی۔ اب وہاں ایک ریگولر پلاٹون بھی تھی۔ یہ نفری پوری بٹالین کا دو طرفی حملہ روکنے کے لیے کافی نہیں تھی اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ دشمن نے اس پوسٹ تک ایمونیشن پہنچانے کا راستہ ۲۷ اپریل سے بند کر رکھا تھا اور دو تین دنوں سے راشن بھی نہیں جانے دیا تھا۔

وہاں ایمونیشن کی مقدار محدود تھی اور جس رفتار سے فائرنگ ہو رہی تھی اس سے ایمونیشن بہت جلدی ختم ہونے کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ایمونیشن ختم ہو جانے کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ کیپٹن جاوید انور اپنی مختصر سی فورس کو ساتھ لے کر بیرُو والی ناڑ سے بھاگ آئیں یا ہتھیار ڈال دیں لیکن اس نوجوان کیپٹن کی قیادت

اور حاضر دماغی اور جوانوں کی حوصلہ مندی نے کرشمہ کر دکھایا۔ وہ گھیرے میں لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلانے کی بجائے، جچا تلا فائر کیا اور ڈیڑھ گھنٹے بعد حملہ پسپا کر دیا۔ اس حملے میں دشمن کا جہاں اور جانی نقصان ہوا، اس کا ایک کمپنی کمانڈر میجر گنگولی بھی مارا گیا۔ اپنے پانچ جوان شہید، تین زخمی اور ایک قیدی ہوا۔

اس پوسٹ تک جانے کا راستہ دشمن نے پوری طرح سر بمہر کر رکھا تھا چنانچہ وہاں سے نہ زخمیوں کو پیچھے لایا جا سکتا تھا نہ لاشوں کو۔ پوسٹ میں ایمونیشن ختم تھا۔ دن کے وقت دشمن نے گولا باری جاری رکھی لیکن حملہ نہ کیا۔ اب خطرہ یہ تھا کہ دشمن کی ایک بٹالین جو توت مار گلی سے اترتی دیکھی گئی تھی، رات کو بیرو والی نارڈ پر حملہ کرے گی۔ اس بٹالین کو یہاں بلانے کا مقصد حملے کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟

آزاد کشمیر کی جو بٹالین یہاں مورچہ بند تھی اس کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید علامہ اقبال علیہ رحمتہ کے مردِ مومن کی مجسم تفسیر تھے۔ زاہد، پارسا، تصوّف کے دلدادہ اور اللہ کے سپاہی۔ اکثر وردِ وظیفے کرتے رہتے تھے اور اپنے جوانوں سے کہا کرتے تھے کہ میں وظیفہ پڑھ رہا ہوں، تم لوگ دشمن کی کسی بھی پوزیشن پر حملہ کرنے کے لیے جاؤ گے تو کوئی بارودی سرنگ تمہارے پاؤں کے نیچے نہیں پھٹے گی ــــــ اپنے جونیئر کمانڈروں کے ساتھ ان کا موضوعِ سخن زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ دشمن سے فلاں پہاڑی لے لی جائے تو ہم یوں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں اور یوں ہم پورے کشمیر کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ کشمیر کی آزادی ان کا جنون بن گیا تھا۔ اپنی بٹالین کے ہر افسر اور جوان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ اگست، ستمبر ۱۹۶۵ء میں کرنل کیانی شہید کمانڈو اپریشن کے لیے مقبوضہ کشمیر کے دور اندر تک گئے اور دشمن کو بے مثال دلیری سے بے تحاشہ نقصان پہنچایا تھا جس کے صلے میں انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا تھا۔

کرنل کیانی شہید نے جوابی کارروائی کا پلان تیار کر لیا، اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو رپورٹ دی۔ بریگیڈیئر ملک عطا محمد نے جو اس وقت بریگیڈ کمانڈر تھے ڈویژن ہیڈکوارٹر کو رپورٹ دی کہ دشمن کیا کر چکا ہے، کیا کر رہا ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں؟ ڈویژن کمانڈر میجر جنرل عبدالمجید ملک تھے جنہوں نے حسینی والا سیکٹر میں

دشمن کا بے حد مضبوط بنکروں کا دفاع توڑا، قیصرِ ہند لیا اور ہیڈ ورکس تک کا علاقہ اور سرحد اور دریائے ستلج کے کنارے تک کا علاقہ قبضے میں لے کر دشمن کے بکتر بند اور انفنٹری ڈویژنوں کو دریا کے اس طرف آنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور لاہور کو محفوظ کر دیا تھا۔

جنرل عبدالمجید ملک وہاں سے تبدیل ہو کر ٹیٹوال لیپا سیکٹر میں ابھی ابھی آئے تھے۔ انہوں نے ابھی ڈویژن کا چارج نہیں لیا تھا۔ علاقے سے بھی متعارف نہیں ہوئے تھے۔ انہیں جب یہ رپورٹ ملی کہ گھیرے میں آئی ہوئی ایک پوزیشن پر دشمن حملہ کر چکا ہے اور اس پوسٹ تک نہ ایمونیشن پہنچایا جا سکتا ہے نہ زخمیوں کو پیچھے لایا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ دشمن ابھی مزید حملے کرے گا تو جنرل مجید ملک کو یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ پوری کی پوری لیپا وادی ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔ چنانچہ وقت ضائع کیے بغیر وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے متعلقہ علاقے میں پہنچے اور فضا سے ہی ساری پوزیشنیں دیکھیں۔ دشمن کی پوزیشنیں بھی دیکھ لیں اور وادی میں اترے۔ کرنل حق نواز کیانی شہید کا پلان ان کے سامنے رکھا گیا۔ بحث مباحثے اور مزید سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ جنرل مجید ملک نے پلان پر نظرِ ثانی کی اور اس فیصلے پر پہنچے کہ اب جبکہ دشمن نے باقاعدہ جنگ شروع کر دی ہے تو یہ قطعاً ضروری نہیں کہ دشمن نے جہاں حملہ کیا ہے ہم وہیں جوابی کارروائی کریں۔ دشمن نے حملہ کر کے ہمیں یہ حق دے دیا ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں جوابی حملہ کریں۔ مقصد دشمن کے آئندہ عزائم کا خاتمہ ہے۔

جنرل عبدالمجید ملک نے جوابی حملے کی منظوری دے دی۔ حملے کا وقت ۴/۵ مئی ۱۹۷۲ء کی رات اڑھائی بجے مقرر کیا گیا۔ وہاں کوئی ریزرو ٹروپس نہیں تھے۔ تمام دستے مختلف پہاڑیوں پر پوزیشنوں میں تھے۔ کوئی بھی پوزیشن چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ حملے کے لیے نفری انہی کمپنیوں سے لینی تھی۔ چنانچہ ایک پلاٹون میجر جمشید گلزار کی کمپنی سے لی گئی۔ پلاٹون کمانڈر بھمبر تحصیل کے گاؤں چھانی تھتھال آزاد کشمیر کے رہنے والے صوبیدار محمد صادق شہید ستارۂ جرأت تھے۔ ایک پلاٹون میجر اشتیاق احمد راجہ کی کمپنی سے لی گئی۔ پلاٹون کمانڈر راجوڑی مقبوضہ کشمیر کے مہاجر صوبیدار غلام محی الدین تھے۔ تیسری پلاٹون ساری بٹالین کے چُنے ہوئے کمانڈو

جوانوں سے تیار کی گئی۔ اس کے پلاٹون کمانڈر پونچھ کے رہنے والے صوبیدار محمد یوسف تھے۔ ایک کمپنی سکاؤٹس کی لی گئی جس کے کمانڈر میجر یار افضل آفریدی تھے ۔۔۔ اور اس فورس کی کمان تحصیل راولاکوٹ کے گاؤں چھتر کے میجر صابر خان شہید ستارۂ جرأت کو دی گئی۔

حملے کے لیے توپخانے کی امدادی گولا باری لازمی تھی لیکن توپخانے کے معاملے میں اپنی بے مائیگی کا یہ عالم تھا کہ پیک بیٹری کی چار گنیں تھیں۔ یہ دقیانوسی قسم کی چھوٹی توپیں ہوتی ہیں جن کا گولا بمشکل تین میل تک جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک سو بیس ملی میٹر کی صرف دو مارٹر گنیں تھیں۔ توپخانہ بیٹری کے کمانڈر تحصیل چکوال کے گاؤں کال کے رہنے والے میجر غلام احمد شہید تھے اور مارٹر بیٹری کے کمانڈر میجر اکرام نبی۔

اس کے مقابلے میں دشمن کا توپ خانہ ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔ ایک میڈیم بیٹری جس میں چھ توپیں تھیں۔ میڈیم توپ کا گولا پچانوے پونڈ کا ہوتا ہے اور نو میل تک جا سکتا ہے۔ دو فیلڈ بیٹریاں جن میں بارہ توپیں تھیں، ان کے گولے سات میل تک جاتے ہیں۔ ایک مارٹر بیٹری آٹھ گنوں کی اور بٹالین کی دو مارٹر پلاٹونیں جن میں بارہ گنیں تھیں ۔۔۔ یہ توپخانہ پوری وادی کو دُور دُور تک زد میں لے سکتا تھا۔ اسے خاموش کرنے کے لیے اپنا توپخانہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایسے دشوار گذار کوہستانی علاقے میں توپخانہ بروقت پہنچانا ناممکن تھا۔ وقت ہمارے خلاف تھا۔ حملہ بہر حال اڑھائی بجے کرنا تھا۔ التوا اور تاخیر کے نتائج تباہ کن ہو سکتے تھے۔

فتح یا موت

شام چھ بجے لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید نے حملے میں شامل ہونے والے دستوں سے خطاب کیا۔ اس سے پہلے وہ جنگی نوعیت کی ہدایات افسروں کو دے چکے تھے جسے بریفنگ کہتے ہیں۔ اب وہ ان کے ساتھ جذباتی قسم کی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ فوج میں جذباتی باتیں نہیں کی جاتیں۔ واضح الفاظ میں احکام دیئے جاتے

ہیں۔ ہر بات حقیقی اور دو ٹوک لہجے میں ہوتی ہے لیکن جس جنگی مہم کے لیے ان مختصر سے دستوں کو بھیجا جا رہا تھا وہ جنگ کے کتابی قاعدوں سے بالا تھی۔ دشمن کی نفری کئی گنا زیادہ تھی۔ دشمن پہاڑوں کی چوٹیوں پر مورچہ بند تھا۔ اس پر حملہ پہاڑ پر چڑھ کر کرنا تھا۔ دشمن کا توپخانہ ہماری نسبت بہت زیادہ تھا وقت رات کا تھا اور جس پہاڑ پر حملہ کرنا تھا اس کی بلندی سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے نو ہزار فٹ اور دامن سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار فٹ تھی۔ اس پہاڑ کا نام چک پترا ہے۔ یہ پہاڑ دشمن سے چھین لینے سے بیر پُر والی ناڑ محفوظ ہو جاتی تھی اور راستہ بھی مل جاتا تھا۔ اس کی دو میل لمبی چوٹی پر سکھ رجمنٹ کی دو کمپنیاں مورچہ بند تھیں۔

ایسے بے حد خطرناک اور مخالف حالات میں جوانوں کو اللہ کے بھروسے پر اور جذبۂ ایمان کی قوت کے بل بوتے پر بھیجا جا رہا تھا۔ لہٰذا کرنل کیانی شہید نے جوانوں کے دلوں میں ایمان کی چنگاری بھڑکانے کے لیے انہیں ایک جگہ جمع کیا اور انہیں کہا کہ آج خدا نے تمہیں بڑے ہی کڑے امتحان میں ڈالا ہے۔ تمہیں ایمان کے تقاضے پورے کرنے ہیں۔ اپنی روایات اور اسلامی روح کو زندہ کرنا ہے اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرنا ہے۔ قوم نے تم سے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں آج وہ پوری کرنی ہیں۔ دشمن نے تمہارے راستے میں بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی ہوں گی۔ میں نے وظیفہ پڑھا ہے۔ تم مائن فیلڈ میں سے گذر جاؤ گے۔ تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی مائن یا بارودی سرنگ، نہیں پھٹے گی ۔۔۔ اس طرح کی تقریر کر کے کرنل حق نواز کیانی شہید نے کفن نکالا اور یہ کہہ کر سر پر لپیٹ لیا کہ پرانے زمانے کے مسلمان سر پر کفن باندھ کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے میجر محمد صابر خان شہید نے جیب سے سفید رومال نکالا اور سر سے لپیٹ کر کہا کہ میرے پاس کفن نہیں ہے، اس رومال کو کفن سمجھا جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کامیابی حاصل کروں گا یا شہادت۔

دونوں افسروں نے فضا کو ایسا جذباتی بنا دیا کہ مہم پر جانے والے افسر اور جوان عام قسم کے سپاہی نہ رہے۔ میں نے ان میں سے چند ایک سپاہیوں اور

عہدیداروں کے تاثرات پُوچھے تھے۔ سب کے الفاظ مختلف تھے۔ لب لباب ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ جب ہمارے کمانڈنگ آفیسر اور کمپنی کمانڈر نے سروں سے کفن باندھے تو ہمارے اندر عجیب سی قسم کی قوت پیدا ہوگئی۔ جوش کا یہ عالم کہ نعرے اپنے آپ ہمارے سینوں سے نکلنے لگے۔ ہم نے دل میں قسم کھائی کہ ناکام واپس نہیں جائیں گے۔ فتح یا موت!

ہر ایک جوان شہادت کے جذبہ سے آگ بگولا ہوگیا۔ حالات ایسے تھے کہ فتح کی نسبت شہادت کے امکانات زیادہ تھے۔ ان دستوں کا اجتماع وادی میں ایسی جگہ کیا گیا تھا جہاں دشمن انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دشمن بلند پہاڑوں پر مورچہ بند تھا۔ کرنل کیانی شہید نے دشمن کو تعداد کا دھوکہ دینے کے لیے ان مختصر سے دستوں کی نمائش اس طرح کی کہ دشمن بلندی سے ان کو دیکھ سکے۔ میں نمائش کے اس طریقے کو مصلحتاً بیان نہیں کر رہا۔

میجر اشتیاق احمد راجہ چک پترا پہاڑ کے سامنے ایک اور پہاڑ پر مورچہ بند تھے جس کی بلندی ساڑھے آٹھ ہزار فٹ تھی۔ انہیں ایک گشتی پارٹی بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ ایک اور پہاڑ پر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) خیرات حسین تمغۂ جرأت کی پوزیشن تھی۔ اُنہیں حکم دیا گیا کہ دشمن پر فائر کریں تاکہ دشمن کی توجہ تقسیم ہو کر حملے کے اصل پہاڑ سے ہٹ جائے۔ رات آٹھ بجے مہم پر جانے والے دستوں نے پیشقدمی شروع کی۔ اُنہیں چک پترا پہاڑ پر حملہ کرنا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق بتا چکا ہوں کہ سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے نو ہزار فٹ بلند اور دامن سے چوٹی تک تقریباً ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی کی لمبائی دو میل سے ذرا زیادہ ہے۔ اُوپر نمبر ۹ سکھ رجمنٹ کی دو کمپنیاں مورچہ بند تھیں۔ مورچے بنکروں کی قسم کے تھے۔ فرق یہ تھا کہ کنکریٹ کی بجائے چیل اور دیودار کے دو فٹ قطر کے تنوں کے بنے ہوتے تھے۔ گولی، گرنیڈ اور گولا انہیں توڑ نہیں سکتا تھا۔ چوٹی پر اُونچی نیچی ٹیکریاں ہیں۔ بعض بنکر ان ٹیکریوں میں اس طرح بنائے گئے تھے کہ تین اطراف کی دیواریں ٹیکریوں کی اور سامنے تنوں کی دیواریں تھیں۔ چھتیں بھی تنوں سے بنائی گئی تھیں۔ بیشتر بنکر

چوٹی کی ایسی ڈھلان میں تھے جہاں سے پہاڑ کا دامن بھی نظر آتا تھا۔ باقی اس کے پیچھے اور اُوپر تھے۔

اب تصوّر فرمائیے کہ اُس بنکروں والی چوٹی تک پہنچ کر دشمن کو بنکروں میں تباہ کرنا تھا۔ یہ بالکل نہ بھولیے کہ دشمن کے یہ مضبوط مورچے میدان میں نہیں ساڑھے چار ہزار فٹ بلند پہاڑ پر تھے۔ پہاڑ کی چڑھائی تقریباً عمودی ہے۔ ذرا اُوپر جاؤ تو سیدھی کھڑی چٹانیں راستہ روک لیتی ہیں جنہیں CLIFFS کہتے ہیں۔ اُس علاقے کے تمام پہاڑوں پر انگلیوں کی طرح دیودار کے درخت ہیں۔ اُن کے سہارے اور اُن کی آڑ میں اُوپر چڑھنا قدرے آسان اور محفوظ ہوتا ہے مگر چک پترا پر یہ قدرتی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اس پہاڑ کی دوسری طرف تو درختوں میں ڈھکی ہوئی ہے لیکن جس طرف سے جوانوں کو اوپر چڑھنا تھا اُس طرف درختوں کی بہت ہی کمی ہے۔ کچھ جھاڑیاں ہیں۔ چڑھائی چڑھنا کہیں بھی آسان نہیں ہوتا لیکن اتنے بلند پہاڑ پر چڑھنا اس لیے بہت ہی دشوار ہوتا ہے کہ سطح سمندر سے اتنی زیادہ بلندی کی وجہ سے فضا میں آکسیجن کی کمی ہے۔ جُوں جُوں اُوپر جاؤ آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ چند گز چڑھائی چڑھو تو سانس اُکھڑ جاتا ہے۔ اکھڑتا بھی ایسی بُری طرح ہے جیسے سانسوں کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور موت واقع ہو جائے گی۔ ان تمام دشواریوں کے علاوہ دشمن نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور موسم اتنا سرد کہ چوٹیوں پر ابھی برف جمی ہوئی تھی اور یخ ہوا چل رہی تھی۔

تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ جب ہمارے جوان ساڑھے چار ہزار فٹ چڑھائی چڑھے ہوں گے تو اُن کی جسمانی حالت کیا ہو چکی ہوگی۔ یہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ انہوں نے ہتھیاروں اور ایمونیشن کا بوجھ بھی اُٹھا رکھا تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ جب وہ نڈھال جسموں سے اُوپر پہنچیں گے تو اُن کا استقبال مشین گنوں کی بوچھاڑوں اور گرنیڈوں سے ہوگا۔ شہادت کا جذبہ اپنی جگہ، انسانی فطرت کی کمزوریوں سے نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لڑائی سے پہلے ذہن پر ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ موت کا لاشعوری خوف اندر ہی اندر سرگرم ہوتا ہے۔ ہیجان اور موت یا زخمی ہونے کا احساس جسمانی قوت کو کم کر دیتا ہے۔

حملہ خاموشی سے کرنا تھا تاکہ دشمن کو بے خبری میں جا لیا جائے۔ کرنل حق نواز کیانی شہید اور توپخانے کے بیٹری کمانڈر میجر غلام احمد شہید چک پترا پہاڑ سے ذرا پیچھے ایک پہاڑی چاننیاں رج پر چلے گئے تھے۔ ان کا ملاپ حملہ آور دستوں اور توپخانے سے تھا اور وہ اس ایکشن کو کنٹرول کر رہے تھے۔ وہ ایسی پوزیشن میں تھے جہاں سے انہیں چک پترا اور اس کے دائیں بائیں کے رج یعنی پہاڑ نظر آسکتے تھے۔

میجر محمد صابر خان شہید کی کمان میں حملہ آور دستے متعلقہ پہاڑ تک جا پہنچے۔ خاموشی کو برقرار رکھا گیا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ دشمن نے کسی طرف کوئی حرکت نہیں کی جوان بکھر کر پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ اور وہ سیدھی کھڑی چڑھائی جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر، پیٹ کے بل رینگ رینگ کر، کیڑوں مکوڑوں کی طرح ایک ایک انچ اوپر چڑھنے لگے۔ ہر انچ پر بارودی سرنگ پھٹنے کا خطرہ تھا۔ اوپر تیز بھی چڑھنا تھا اور خاموشی بھی برقرار رکھنی تھی۔ جوان رائفلوں، سٹین گنوں اور مشین گنوں کو اس طرح اپنے جسموں سے لگائے ہوئے تھے کہ پتھر سے ٹکرا کر آواز پیدا نہ کریں۔ آواز پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن بیدار ہو جاتا اور وہ بڑے بڑے پتھر ہی نیچے لڑھکانے لگتا تو جوان پتھروں کے ساتھ نیچے آرہتے اور شاید ہی کوئی زندہ رہتا۔ دشمن کی پوزیشن ویسی ہی تھی جیسے وہ منڈیر پر بیٹھا ہو اور آپ دیوار پر ہاتھ اور پاؤں جما کر اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے دشمن آپ کا کیا حشر کر سکتا ہے۔

اُوپر بھی موت، نیچے بھی موت

جوان ایک ہزار فٹ بلندی پر چڑھ گئے۔ میجر یار افضل آفریدی کے زیرِ کمان سکاؤٹس تھے جو الگ سمت سے اوپر چڑھ رہے تھے۔ جب ایک ہزار فٹ بلندی پر پہنچے تو یہ تکلیف دہ اطلاع ملی کہ تقریباً اسی (۸۰) سکاؤٹس لاپتہ ہو گئے ہیں۔ میجر آفریدی کے ساتھ صرف پندرہ سکاؤٹس رہ گئے۔ اگر علاقہ میدانی ہوتا تو کسی جوان کو بھیج کر انہیں تلاش کیا جا سکتا تھا مگر ایک ہزار فٹ عمودی بلندی سے نیچے آنا یا ادھر اُدھر گھوم پھر کر انہیں تلاش کرنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔ بلند آواز سے انہیں پکارا

بھی نہیں جا سکتا تھا۔ حملہ بھی ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دو چار جوان لاپتہ ہو جاتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اسی کی نفری پوری کمپنی ہوتی ہے اور اس کمپنی کے ذمے جو ٹاسک تھا وہ دھرا رہ گیا تھا۔ حملہ آور ٹروپس رک گئے۔ سارا پلان تباہ ہوتا نظر آنے لگا۔

کرنل کیانی شہید کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے پلان میں کچھ تبدیلی کر کے پیش قدمی جاری رکھنے کو کہا اور حکم دیا کہ جو نفری باقی ہے اسی سے حملہ کیا جائے۔ البتہ حملے کا وقت ایک گھنٹہ آگے کر دیا گیا۔ لاپتہ نفری کی گمشدگی اور نئی ہدایات کی وجہ سے تین گھنٹے ضائع ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ اندھیرے اور پہاڑ کے پیچیدہ خد و خال کی وجہ سے یہ اسی جوان بھٹک گئے تھے۔ بھٹکے بھی ایسے کہ نیچے ہی نیچے ہوتے گئے اور کمپنی سے بالکل ہی کٹ گئے۔ حملہ کرنے والے ٹروپس کا تیسرا حصہ کٹ گیا جس سے مہم کے خطرات میں اضافہ ہو گیا۔ کمپنی کمانڈر میجر محمد صابر خان شہید اور میجر یار افضل آفریدی شہید، بٹالین کمانڈر، بریگیڈ کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر کا اعصابی تناؤ بڑھ گیا۔ وہ دم بخود تھے۔ انہوں نے جوانوں کے جذبے اور اللہ کے بھروسے ایک عظیم خطرہ مول لیا تھا۔ حالات اور قرائن ہر پہلو سے ان کے خلاف تھے۔ گو یہ ایک CALCULATED RISK تھا مگر CALCULATIONS نے دھوکہ دینا شروع کر دیا تھا۔

چک پترا پہاڑ کی ایک قریبی پوسٹ پر میجر جمشید گلزار کی کمپنی مورچہ بند تھی۔ اس پوسٹ کی بلندی آٹھ ہزار فٹ تھی یعنی دامن سے چوٹی تک تقریباً تین ہزار فٹ۔ اس کمپنی سے پہلے ہی ایک پلاٹون لی جا چکی تھی۔ اسی سکاؤٹس کے لاپتہ ہونے کے بعد میجر جمشید گلزار کو حکم دیا گیا کہ وہ باقی دو پلاٹونوں کو بھی نیچے اتاریں اور حملہ آور ٹروپس میں شامل ہو جائیں۔ انہیں دوسری سمت سے حملہ کرنے کی ہدایت دی گئی۔ ان پلاٹونوں کے کمانڈر لیفٹیننٹ طاہر سہیل اور صوبیدار محمد اقبال تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اترنا شروع کر دیا —— جن حضرات کو بیپا وادی جیسے عمودی پہاڑوں سے اترنے کا تجربہ نہیں وہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ایسے پہاڑ سے اترنا، چڑھنے سے کہیں سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

جسم کا وزن اور توازن پاؤں جما کر گھٹنوں پر لینا پڑتا ہے۔ ٹخنے اور گھٹنے درد کرنے لگتے ہیں۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ تیز نہیں اُترا جا سکتا۔ نہایت آہستہ اترنا پڑتا ہے۔ پاؤں پھسل جانے کی صورت میں انسان لڑھکتا اور قلابازیاں کھاتا نیچے آتا ہے اور کوئی ہڈی سلامت نہیں رہتی۔ نتیجہ موت ہی ہوتا ہے —— میجر جمشید گلزار کے راستے میں سب سے بڑی دو دشواریاں تھیں۔ تین ہزار فٹ اترنا اور دم لیے بغیر ساڑھے چار ہزار فٹ اوپر چڑھنا۔ اس عمل میں کئی گھنٹے صرف ہونے کا امکان تھا۔

میجر محمد صابر شہید کی کمپنی اور میجر یار افضل آفریدی کے پندرہ سکاؤٹس اوپر ہی اوپر سرکتے جا رہے تھے۔ وہ دو ہزار فٹ تک پہنچے۔ پھیپھڑے دھونکنیاں بن گئے۔ جسم شل ہونے لگے۔ آگے عمودی چٹانیں آگئیں جو بہت اونچی اونچی دیواروں کی مانند تھیں۔ جوان ان پر کوہ پیماؤں کی طرح چڑھنے لگے۔ ان کے منہ کھل گئے تھے اور زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ ہتھیاروں اور ایمونیشن کے بوجھ تلے وہ اوپر ہی اوپر سرکتے گئے۔ رات بہت تیزی سے گذرتی جا رہی تھی۔ چوٹی پر صبح کی پہلی کرن سے بہت پہلے پہنچنا تھا۔ وہ جوں جوں اوپر چڑھتے جا رہے تھے، چڑھائی عمودی اور جسم بیکار ہوتے جا رہے تھے۔ اس بلندی پر اگر دشمن بیدار ہو جاتا تو انہیں پتھروں سے مار کر موت کی وادی میں پھینک سکتا تھا۔ اگر کوئی جوان نڈھال ہو کر یا پھسل کر گر پڑتا تو اس کے لئے بھی یقینی موت تھی۔ اب اُوپر بھی موت اور نیچے بھی موت!

میں اس پہاڑ پر چڑھا ہوں اور اُترا بھی ہوں۔ چوٹی پر جا کر جہاں معرکہ لڑا گیا تھا، میں نے نیچے دیکھا۔ منظر بے حد حسین بلکہ خوابوں کی طرح حسین ہے۔ اگر پریوں اور جنوں والے کوہ قاف کی کوئی حقیقت ہے تو وہ یہی ہے مگر بلندی اتنی کہ دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے۔ نیچے بہتی ہوئی ندی ایک ٹیڑھی لکیر کی طرح نظر آتی ہے۔ میں نے وہ عمودی چٹانیں بھی دیکھیں جہاں سے جوان اُوپر چڑھے تھے۔ بخدا یقین نہیں آتا کہ انسان وہاں سے چڑھ سکتا ہے۔ مگر وہ چڑھ گئے تھے۔

ابھی تک کوئی بارودی سرنگ نہیں پھٹی تھی حالانکہ جوان مائن فیلڈ میں سے

گزر رہے تھے۔ ڈھلان میں دشمن نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ کرنل کیانی شہید کی پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہو رہی تھی کہ تم مائن فیلڈ سے گزر جاؤ گے، کوئی مائن نہیں پھٹے گی —— جوان اوپر چڑھ گئے اور چڑھتے ہی چلے گئے۔ ایسے نڈھال جسموں سے انہیں لڑنا بھی تھا جب کہ دشمن اوپر گرم بنکروں میں بیٹھا آرام کر رہا تھا۔ دشمن ابھی بے خبر تھا۔

آخر مقصود دو سو گز دور رہ گیا۔ چوٹی نظر آنے لگی۔ جو جوان رات آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ سحر کے ساڑھے تین بجے مقصود تک پہنچے۔ ابھی دو سو گز کی بلند مسافت باقی تھی۔ یہاں آکر خاموشی ٹوٹ گئی۔ جوان کب تک خاموشی قائم رکھتے۔ ان کے جسم اکڑ گئے تھے۔ اب تو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتے تھے، ہتھیاروں کو کہاں تک سنبھالتے۔ کسی جوان کے پھسلنے سے اس کا ہتھیار پتھروں سے لگا۔ دشمن کا ایک مورچہ وہاں سے دو سو گز دُور تھا۔ اس مورچے کی مشین گن نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی کئی مشین گنوں کا فائر کھل گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں باد و باراں کے طوفان کی طرح آنے لگیں۔ جن میں سے زندہ گزر جانا ممکن نہ تھا۔ ہمارے جوان دشمن کو نظر نہیں آ رہے تھے، وہ ان کی موجودگی کو صرف فرض کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے گنر گنوں کی نالیاں گھما گھما کر برسٹ فائر کر رہے تھے جسے فوجی زبان میں SWEEPING FIRE کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے اپنے توپخانے کو فائر آرڈر دے دیا اور جب گولا باری شروع ہوئی تو یہ قیامت خیز گولا باری تھی۔ میڈیم توپ خانے کے گولے سب سے زیادہ خوفناک تھے۔

ہمارے جوان نڈھال ہو چکے تھے۔ طبی نقطہ نگاہ سے وہ تو پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ سانسیں سنبھل نہیں رہی تھیں۔ آگے دو سو فٹ چڑھائی ابھی باقی تھی اور فائر بارش کی طرح آ رہا تھا۔ دشمن کے توپ خانے کے گولے انہی ڈھلانوں پر پڑ رہے تھے جہاں جانباز پوزیشن لیے دشمن کے بنکروں کی طرف رینگ رینگ کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ دُور پیچھے بٹالین اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر والے اس حقیقت کو قبول کرتے چلے جا رہے تھے کہ اپنا کوئی بھی جوان زندہ

نہیں بچا۔ فائر اور گولا باری کی شدت ہی ایسی تھی۔ وہاں چیل اور دیودار کے
درختوں کی بہتات ہے۔ توپوں کے وزنی گولوں سے درخت لوٹنے اور جلنے
لگے۔ دونوں قسم کے درخت فوراً آگ پکڑ لیتے ہیں۔ اب ہمارے جانبازوں
کے لئے وہاں صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ آگے سے بارش کی طرح
گولیوں کی بوچھاڑیں آ رہی تھیں، اُوپر سے گولے پھٹ رہے تھے اور اس
کے ساتھ درخت لوٹ لوٹ کر گر بھی رہے تھے، جل بھی رہے تھے گرتے
درختوں تلے دب کر مرنے کا خطرہ بھی تھا اور بارودی سرنگیں الگ تھیں۔ کسی طرف
سے بچ کے نکلنے کا امکان ہی نہیں تھا۔

آگ کے اس طوفان میں جہاں تپتے ہوئے لوہے کے ٹکڑے
اور پتھر چٹانوں اور زنالوں سے اُڑ رہے تھے اور گولیاں چیخ رہی تھیں، آزاد کشمیر
کے ان سپوتوں کے حوصلے متزلزل نہ ہوئے۔ وہ آتشِ نمرود میں آگے ہی آگے
رینگتے گئے۔ میجر یار افضل آفریدی نے پلان کے مطابق اپنے پندرہ جوان
ساتھ لئے اور پہاڑ کی اُس طرف والی ڈھلان پر جا پوزیشن لی جس طرف سے
اوپر والے دشمن کو نیچے سے مدد بھیجی جا سکتی تھی۔ اُس طرف نالہ تھا اور پہاڑ کی
ڈھلان عمودی نہیں تھی۔ ان پندرہ جوانوں نے کمک کا راستہ سربمہر کیے رکھا۔

میجر محمد صابر خان شہید حملے کی قیادت کر رہے تھے۔ انہوں نے چارج
کا حکم دے دیا اور ان کی کمپنی نے دشمن کے بنکروں پر ہلہ بول دیا۔ وہاں درختوں
کی آڑ میسر تھی۔ ابھی سحر کی تاریکی تھی۔ مشین گنوں کی نالیوں سے نکلتے شرارے
گن پوزیشنوں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ جب جوان اور آگے گئے تو دشمن نے ان
پر گرینیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ قدم قدم پر دھماکے ہونے لگے۔ ہمارے
جوانوں نے درختوں کی آڑ سے راکٹ لانچر کا فائر کھول دیا اور گرینیڈ بھی پھینکنے
لگے۔ دشمن کو بنکروں کی مضبوط اور محفوظ سہولت حاصل تھی۔ اب جو معرکہ لڑا جا رہا
تھا وہ ذاتی شجاعت کا معرکہ تھا۔ ہر ایک جوان اپنی اپنی جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ ایسی صورت ہوتی
ہے جو اکثر و بیشتر شکست کا باعث بنتی ہے کیونکہ سپاہی کمان سے الگ ہو جاتے تو وہ اپنے
تحفظ کو ترجیح دیتا ہے، لیکن یہاں صورتِ حال بالکل اُلٹ تھی۔ آزاد کشمیر کے یہ

جانباز مادرِ وطن کی آبرو کی خاطر لڑ رہے تھے۔ وہ قسم کھا کر آئے تھے، فتح یا موت
ہر جوان یہی سوچ رہا تھا کہ کشمیر کی عصمت کا رکھوالا وہ اکیلا ہے، باقی سب شہید
ہو گئے ہیں۔

کمان ٹوٹ چکی تھی۔ ایک پلاٹون کے کمانڈر صوبیدار محمد صادق ایک بنکر
کی طرف بڑھے تو ایک مشین گن برسٹ کی زد میں آ کر شہید ہو گئے۔ دوسری پلاٹون
کے کمانڈر صوبیدار غلام محی الدین آگے بڑھے تو ایک گرینیڈ ان کے قریب
آن پھٹا۔ وہ شدید زخمی ہو گئے۔ انہوں نے اٹھنے کی بہت کوشش کی مگر زخموں
نے انہیں اٹھنے نہ دیا۔ صوبیدار محمد صادق شہید کی جگہ حوالدار سخی محمد نے کمان
لی اور صوبیدار غلام محی الدین کی پلاٹون کی کمان حوالدار غلام مرتضےٰ نے سنبھال لی۔
یہاں سے جوان بکھر گئے اور اپنی اپنی جنگ لڑنے لگے۔ پہلے ہلے میں ایبٹ آباد
کے گاؤں گھبر کا رہنے والا سپاہی علی زمان اور مظفر آباد کے گاؤں انوار شریف
کا رہنے والا سپاہی محمد لطیف الدین شہید ہو گئے اور نائیک محمد یونس، سپاہی نادر،
نائیک رشید، لانس نائیک سیف علی، سپاہی تاج، سپاہی محمد نذر اور نائیک حسین محمد
زخمی ہو گئے۔

اپنے توپ خانے کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا۔ اپنی توپیں
بہت چھوٹی تھیں، اور رینج کم، اس لئے انہیں بہت آگے پوزیشن میں
رکھا گیا۔ مارٹر گنوں کو بھی آگے لے جایا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید،
بیٹری کمانڈر میجر غلام احمد شہید کے ساتھ چاننیاں رج پر تھے۔ وہاں سے
وہ توپ خانہ اور مارٹر بیٹری کو فائر آرڈر دے کر گولا باری کرا رہے تھے۔

میجر اشتیاق احمد راجہ اپنی کمپنی کے ساتھ ایک اور پہاڑ پر مورچہ بند تھے جس
کی بلندی ساڑھے آٹھ ہزار فٹ ہے۔ ان کے بالکل سامنے اور اِدھر اُدھر کی پہاڑیوں
پر دشمن مورچہ بند تھا۔ میجر اشتیاق احمد راجہ کو وہاں کی مشین گن پوزیشنیں نظر آتی تھیں۔ انہوں
نے پہلے ان پوسٹوں پر گولا باری کرائی۔ ان پر مشین گن فائرنگ بھی کی اور انہیں خاموش
کر دیا۔ میجر محمد صابر خان شہید بھی اپنی ضرورت کے مطابق چک پترا پر گولا باری کرا رہے
تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ چار چھوٹی توپیں اور دو مارٹر گنیں اتنے زیادہ ٹارگیٹ نہیں

لے سکتی تھیں لیکن ان کا فائر اس قدر صحیح تھا کہ کوئی گولا ضائع نہیں ہوتا تھا۔

مقابلہ سکھوں سے تھا

ہمارے جوانوں نے بنکروں پر نعرے لگا کر ہلہ بول دیا تھا۔ وہ بنکروں کے قریب جا جا کر اندر گرینیڈ پھینک رہے تھے اور راکٹ لانچروں والے اُن پر الگ گولے فائر کر رہے تھے۔ یاد رکھیئے کہ راکٹ لانچر ٹینک شکن ہتھیار ہوتا ہے۔ جوانوں کی ایسی بے جگری نے دشمن پر دہشت طاری کر دی اور وہ یقیناً تعداد کے دھوکے میں بھی آگیا ہوگا۔ اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ جو اتنی بلندی پر آکر اس طرح بے خوفی سے لڑ رہے ہیں وہ تھوڑے نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ان کی تعداد صرف ایک سو پندرہ تھی جن میں سے پندرہ سکاؤٹس میجر یار افضل آفریدی کے ساتھ اس ہلّے میں شریک نہیں تھے۔ وہ ایک ڈھلوان پر پوزیشن لیے دشمن کی کمک کو روکے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو سکاؤٹس شہید ہو چکے تھے۔ میجر صابر کی کمپنی کے کئی جوان شہید اور زخمی ہو چکے تھے۔ دشمن کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔

یہاں آل انڈیا ریڈیو کی رپورٹ بے محل نہ ہوگی۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء کے نشریے میں آل انڈیا ریڈیو نے کہا تھا کہ ہماری پوسٹ پر صرف ستر جوان تھے جن پر پاک فوج کی پوری بٹالین نے سات سو نفری سے بے خبری میں حملہ کر دیا۔ ہمارے (بھارتی) جوانوں کو پوسٹ چھوڑنی پڑی ـــــ یہ غالباً سکھ رجمنٹ کی دی ہوئی رپورٹ ہوگی۔ جس جرأت سے ہمارے جوانوں نے حملہ کیا، سکھوں کی جگہ کوئی بھی ہوتا اُسے ایک کے سات سات نظر آتے اور وہ ایک سو کو سات سو ہی کہتا۔

دشمن بُری طرح مر رہا تھا۔ آخر وہ بھاگنے لگا لیکن بھاگ نکلنے کے امکانات کم تھے۔ ہمارے جانباز ۹ سکھ رجمنٹ کے بھاگتے سکھوں کو چُن چُن کر مارنے لگے۔ جو دوسری طرف کی ڈھلان سے اترنے میں کامیاب ہو گئے وہ اپنی

ہی بچھائی ہوئی بارودی سرنگوں میں جا پھنسے اور ان کی اپنی سرنگیں ان کے پرخچے اڑانے لگیں ـــــ ساڑھے چار بجے تک چک پترا کی دو اڑھائی میل لمبی چوٹی کا پہلا حصہ لے لیا گیا۔ یہ پلان کا پہلا مرحلہ تھا جو جان اور خون کے نذرانے دے کر کامیابی سے طے کر لیا گیا۔

اب معرکے کا دوسرا مرحلہ شروع ہُوا جو پہلے سے بہت ہی زیادہ دشوار اور پُرخطر تھا۔ اپنی نفری شہیدوں اور زخمیوں کی وجہ سے کم ہو گئی تھی اور جو رہ گئی تھی وہ تھکن سے چور تھی۔ آگے پہاڑ کی چوٹی اور بلند تھی یعنی آگے ٹیکری تھی۔ اس میں بنی ہوئی پوزیشنیں بنکروں کی طرح مضبوط تھیں۔ سامنے بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں ان کے پیچھے خار دار تار تھا اور اس کے ساتھ زمین میں نوکیلے ڈنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان رکاوٹوں کو عبور کرنا محال تھا۔ دشمن بے تحاشا فائر کر رہا تھا۔ گولا باری بہت ہی تیز اور شدید تھی۔ جوان آڑ لے لے کر یا رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑ کی دوسری طرف سے میجر جمشید گلزار کی کمان میں دو پلاٹونیں اوپر چڑھ رہی تھیں۔ ان کے راستے میں بھی بارودی سرنگیں تھیں اور گولا باری بھی ہو رہی تھی۔ یہ پلاٹونیں ایک پہاڑ سے اُتر کر دوسرے پر چڑھ رہی تھیں۔

اس طرف سے میجر محمد صابر خان شہید خار دار تار، نوکیلے ڈنڈوں اور بارودی سرنگوں کو عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ صبح طلوع ہو چکی تھی۔ روشنی ہمارے جوانوں کے لئے زیادہ خطرناک تھی۔ میجر محمد صابر کا جوش و خروش اور ان کی للکار جوانوں میں نئی رُوح پھونک رہی تھی۔ وہ اپنے جوانوں سے آگے تھے اور ان کی للکار دُور دُور تک سنائی دے رہی تھی۔ دشمن ان پر گولیوں کا مینہ برسا رہا تھا۔ ایسے عالم میں تار کاٹنا ممکن نہ تھا، لیکن جوانوں نے ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیا ـــــ اس مرحلے کے آغاز میں ہی ہمارے جانبازوں نے ایمونیشن کی کمی محسوس کی جو دشمن کے اس ایمونیشن سے پوری کر لی گئی جو وہ پہلے مرحلے میں پھینک کے بھاگ یا مر گیا تھا۔ دوسرے مرحلے میں دشمن کا ہی ایمونیشن اور ہتھیار بھی استعمال ہونے لگے۔

دشمن کے جو مورچے بہت مضبوط تھے ان پر راکٹ لانچر فائر کئے گئے اور

گرینیڈ بھی پھینکے گئے، لیکن دشمن اس مرحلے میں جم کر مقابلہ کر رہا تھا۔ اب کرنل کیانی شہید، میجر غلام احمد شہید اور میجر اشتیاق احمد راجہ کو دن کی روشنی زیادہ ہو جانے کی وجہ سے دُور دُور تک کا علاقہ نظر آنے لگا۔ وہ تارگیٹ دیکھ دیکھ کر گولا باری کرنے لگے، مگر دشمن کے میڈیم توپ خانے کی گولا باری بڑی سخت تھی۔ دن کی روشنی اور زیادہ نکھری تو دوسری طرف سے میجر جمشید گلزار کی پلاٹونیں بھی اُوپر پہنچ گئیں، مگر دشمن خوب مقابلہ کر رہا تھا۔

یہاں ذاتی شجاعت کے مظاہرے پہلے مرحلے کی نسبت زیادہ ہوئے۔ ایک جگہ دشمن کا مشین گن کا مورچہ تھا جو راستہ روکے ہوئے تھا۔ اپنے دو جوان، تحصیل راولاکوٹ کے گاؤں تبال کا رہنے والا سپاہی محمد مشتاق اور تحصیل بھمبر کے گاؤں گراول کا رہنے والا سپاہی محمد لطیف دشمن کی اس مشین گن کی طرف بڑھے لیکن گن نے دونوں کو شہید کر دیا۔ تحصیل بھمبر کے گاؤں پونا کے رہنے والے حوالدار نور عالم کے پاس سٹین گن تھی۔ اُس نے دشمن کی اس مشین گن کو دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ایک جوان سے لائٹ مشین گن لے لی اور ایک طرف سے رینگ کر مشین گن سے تیس گز کے فاصلے تک چلا گیا۔ وہاں سے اُس نے لائٹ مشین گن فائر کر کے دشمن کے گنروں کو ختم کر کے مشین گن کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

حوالدار نور عالم کو ایسا ہی ایک اور مورچہ نظر آ گیا۔ وہ اس کی طرف رینگنے لگا مگر قریب پہنچا ہی تھا کہ دشمن نے اسے دیکھ لیا اور مشین گن کا برسٹ فائر کر کے اسے شہید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ضلع مظفر آباد کے گاؤں بندی بالا کا رہنے والا سپاہی محمد بشیر بھی شہید ہو گیا۔ زخمیوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ نائک شیر افضل، نائک خان محمد، لانس نائک رشید، سپاہی علی اصغر شاہ، سپاہی محمد حسین، سپاہی خادم حسین، سپاہی محمد رشید، سپاہی جہانگیر اختر، سپاہی محمد سرور، سپاہی عزیز احمد، سپاہی تاج اور نائک منیر حسین زخمی ہو چکے تھے۔ وہاں سے شدید زخمیوں کو فوری طور پر پیچھے لانا کسی پہلو ممکن نہیں تھا۔ جو لڑنے کے قابل تھے، زخموں کے باوجود لڑتے رہے اور جو ہل جل نہیں سکتے تھے، اپنا خون روکنے کی خود ہی

کوشش کر رہے تھے۔

نفری اتنی زیادہ کم ہو گئی لیکن جوں جوں نفری کم ہوتی جا رہی تھی جوانوں کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا حوصلہ تو میجر صابر شہید کے جوش و خروش اور جانبازانہ قیادت کی بدولت زندہ و پائندہ تھا۔ دونوں کمپنی کمانڈر، میجر محمد صابر خان شہید اور میجر جمشید گلزار جہاں کمان کر رہے تھے وہاں وہ سپاہیوں کی طرح لڑ بھی رہے تھے۔ دشمن کے بنکروں یا مورچوں کی طرف رینگتے، فائر کرتے اور گرینیڈ پھینکتے تھے۔

ساڑھے چھ بجے یہ مرحلہ بھی کامیاب ہو گیا۔ دشمن کی لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ باقی سورمے بھاگے اور ڈھلان سے اترنے لگے۔ زخمی راستے میں ہی گرے اور دم توڑ گئے۔ اس مرحلے میں سکھ رجمنٹ کی ان دو کمپنیوں میں سے ایک کا کمپنی کمانڈر میجر ڈیسوزا مارا گیا۔ چوٹی کے اوپر دشمن کی جو لاشیں گنی گئیں ان کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ دوسری طرف کی ڈھلان درختوں میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اس طرف جو لاشیں تھیں وہ گنی نہیں جا سکیں اور جو بھارتی اِدھر اُدھر گولہ باری سے مرے وہ اس گنتی میں شامل نہیں۔ آل انڈیا ریڈیو نے ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء کے نشریے میں اپنی کمپنیوں کی نفری ستر (۷۰) بتائی تھی مگر جب یہ نفری لاشوں میں تبدیل ہوئی تو ستر سے ایک سو بیس ہو گئی۔

یہاں ایک مقامی مجاہد کا ذکر لازمی ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ یہ ادھیڑ عمر مجاہد لیپا گاؤں کا رہنے والا ہے۔ وہ چونکہ اسی خطے میں جنا پلا ہے اس لئے وادی کا بھیدی ہے اس نے حملہ کرنے والے ٹروپس کی راہنمائی کی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ رہا معرکے میں اس طرح شریک ہوا کہ دشمن پر گرینیڈ پھینکتا رہا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اس لئے پہلے وہ اگست، ستمبر ۱۹۶۵ء میں کمانڈو اپریشن کے لئے مقبوضہ کشمیر بھی گیا تھا۔

کفن باندھے شہید ہوئے

دوسرا مرحلہ مکمل طور پر کامیاب ہو گیا۔ تمام کا تمام رج (پہاڑ) دشمن سے

چھین لیا گیا۔ بچا کھچا دشمن نیچے نالے میں جمع ہو رہا تھا۔ چک پترا کی چوٹی سے وائرلیس سے کرنل کیانی شہید کو خوشخبری سنائی گئی کہ مشن مکمل ہو گیا ہے۔ وہ میجر غلام احمد شہید کے ساتھ چاننیاں رج پر محفوظ پوزیشن سے اِدھر اُدھر گولہ باری کرا رہے تھے اور چوٹی پر لڑے جانے والے معرکے کی رپورٹیں لے رہے تھے۔ فتح کی خوشخبری سن کر وہ پوزیشن سے نکل آئے۔ توپ خانے کے میجر غلام احمد ان کے ساتھ باہر نکلے۔ ان کے ساتھ وائرلیس آپریٹر وغیرہ حوالدار گلزار، لانس نائیک کبیر اور لانس نائیک ذاکر حسین شاہ بھی تھے۔ وہ بھی اپنے افسروں کے ساتھ باہر نکلے۔ یہ پارٹی پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ معلوم نہیں کہ دشمن کے توپ خانے کے او پی نے انہیں دیکھ لیا یا ویسے ہی کوئی گولہ ادھر آ گیا۔ بہرحال اس پارٹی کے درمیان میڈیم گن کا گولہ پھٹا جس سے تحصیل جہلم کے گاؤں جاوا کے رہنے والے لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی، تحصیل چکوال کے گاؤں کال کے رہنے والے میجر غلام احمد اور راولاکوٹ کے رہنے والے لانس نائیک کبیر شہید ہو گئے۔ حوالدار گلزار اور لانس نائیک ذاکر حسین شاہ زخمی ہو گئے —— کرنل کیانی شہید کے سر پر کفن بندھا ہوا تھا اور کفن پر انہوں نے اپنے ہاتھوں عطر لگا رکھا تھا اور یوں آزاد کشمیر فورسز کا یہ عظیم افسر آزاد کشمیر کو بھارتی استبداد سے آزاد کرانے کے جنون کو معطر کفن میں لپیٹ کر خدا کے حضور لے گیا۔

اب تیسرا مرحلہ سامنے آیا۔ یہ تھا MOPPING UP یعنی پیچھے کھچے اور کہیں کہیں چھپے ہوئے دشمن کا صفایا کرنا اور دشمن کے متوقع جوابی حملے روکنا۔ دشمن کا جوابی حملہ کسی بھی وقت متوقع تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اتنا بڑا رج دے کر دشمن اطمینان سے پیچھے جا کے بیٹھ جاتا۔ اس کے پاس نفری کی کمی نہیں تھی نہ اس کے پاس اسلحہ اور بارود کی کوئی کمی تھی۔ یہ مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ علاقے کو دشمن سے صاف کرنا ضروری تھا۔

یہ ۵ مئی ۱۹۷۲ کی صبح تھی۔ نو بجے دشمن نے ایک چوٹی سے بہت سی نفری اتار کر کھوئے ہوئے پہاڑ پر چڑھنے اور ہمارے دستوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی۔ اس حملے کو کور کرنے کے لئے جو دشمن نے گولہ باری کی وہ بہت

ہی شدید تھی جسے فوجی زبان میں INTENSE کہتے ہیں۔ اس نفری کو مدد دینے کے لئے چک پترا کا بھاگا ہوا کچھ دشمن نیچے نالے کے قریب جمع ہو رہا تھا۔ میجر اشتیاق احمد راجہ جو ایک چوٹی پر مورچہ بند تھے ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے قریب کی چوٹی سے دشمن کی ایک پلاٹون اتر رہی تھی۔ وہ یقیناً حملے میں مدد دینے کے لئے اتاری جا رہی تھی۔ میجر اشتیاق احمد راجہ نے اپنی کمپنی کے صوبیدار فیروز الدین کو پندرہ جوان دے کر اپنی چوٹی سے اس مقصد کے لئے اتارا کہ دشمن کی اس پلاٹون کو گھات لگائیں۔ ایسے اپریشن کے لئے جنگل نہایت موزوں ہے۔ صوبیدار فیروز الدین گھنے درختوں کی اوٹ سے فائدہ اٹھاتے پندرہ جوانوں کو ساتھ لے کر تیزی سے نیچے اترے اور گھات لگائی۔ ان کا چھپاؤ اچھا تھا۔ دشمن کی پلاٹون قریب سے گزری تو صوبیدار فیروز الدین اور ان کے جوانوں نے فائر کھول دیا۔ دشمن کے پندرہ آدمی تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ باقی بکھر کر بھاگ گئے۔

دشمن نے اپنی چوٹی سے صوبیدار فیروز الدین کی پارٹی کی گھات کی جگہ مشین گن فائرنگ اور توپ خانے کی گولہ باری شروع کر دی۔ جوان مشن مکمل کر چکے تھے۔ درختوں کی آڑ میں اوپر چلے گئے لیکن حوالدار محمد صدیق وہیں کہیں چھپا رہا۔ اس کی نظر دشمن کے مرے ہوئے آدمیوں کے ہتھیاروں اور ایمونیشن پر تھی۔ لاشیں ڈھلان پر پڑی تھیں۔ حوالدار محمد صدیق رینگ رینگ کر نیچے گیا۔ جتنے ہتھیار اپنے ساتھ گھسیٹ سکتا تھا اکٹھے کر کے اوپر کو رینگنے لگا۔ ہتھیار اوپر رکھ کر پھر نیچے چلا گیا۔ دشمن کی گولہ باری مسلسل اسی جگہ آ رہی تھی اور مشین گنوں کا اکا دکا برسٹ بھی آتا تھا۔ حوالدار محمد صدیق اس گولہ باری اور مشین گنوں کی بوچھاڑوں میں دشمن کے تمام ہتھیار اور ایمونیشن چند ایک پھیروں میں اٹھا لایا۔

چک پترا پر دشمن چڑھ گیا۔ چوٹی پر اس کا توپ خانہ اولوں کی طرح گولے برسا رہا تھا۔ اوپر اپنے جوانوں نے ابھی اپنے زخمیوں کو نہیں سنبھالا تھا نہ جوابی حملہ روکنے کے لئے پوزیشنیں قائم کی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے دشمن کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے پاس اب ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دشمن بے

شمار ایمونیشن چھوڑ گیا تھا۔ گرینیڈوں سے انہوں نے دشمن کو اوپر نہ آنے دیا اور
دشمن کئی ایک لاشیں چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔

الفاظ میں بہت ہی سہل لگتا ہے کہ دشمن کو پسپا کر دیا گیا مگر عملاً یہ کام بےحد
دشوار تھا۔ ہمارے جوان گذشتہ شام چھ بجے اجتماع گاہ میں جمع ہوئے تھے اور اب
دن کے دس گیارہ بج رہے تھے۔ رات کی سخ ٹھنڈ میں وہ چک پترا رج تک پہنچے
سحر کے تین بجے تک پہاڑ پر چڑھتے رہے اور فوراً ہی بعد دشمن سے الجھ گئے۔
وہ دوڑ دوڑ کر اور لیٹ لیٹ کر لڑے۔ ان کے جسم چور چور ہو گئے تھے۔ مرنے
کا احساس ہر لمحہ اعصاب پر چھایا ہوا تھا اور انہوں نے اس جسمانی حالت میں حملہ رد کا
جب کہ ان کی نفری کم ہو گئی تھی۔ دشمن کوئی ایسا اناڑی یا بزدل نہیں تھا۔ وہ بھارت
کی جنگجو قوم تھی۔ سکھوں کی تاریخ جنگوں سے بھرپور ہے۔ ایسی قوم کے سپاہیوں کو
شکست دینا آسان نہیں تھا۔ ہمارے جوان چوٹی کی اترائیوں اور چڑھائیوں پر دوڑ دوڑ کر
پوزیشن لیتے تھے فائر کرتے اور پوزیشن بدلتے تھے۔ یہ میدانی جنگ نہیں پہاڑی اور جنگلاتی
جنگ تھی جو سب سے زیادہ دشوار اور خطرناک ہوتی ہے۔ ہمارے جوان جذبے
کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ سب آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے جن میں مقبوضہ
کشمیر کے مہاجر بھی تھے۔ ان کے دلوں میں بھارتیوں کے خلاف قہر اور غضب
بھرا ہوا تھا اور یہی ہمارے جوانوں کی بنیادی قوت تھی۔ ورنہ انہوں نے جو معرکہ لڑا
وہ کسی جنگی قاعدے میں نہیں آتا۔

سکھ بھاگے، ہندو آئے، وہ بھی گئے

دشمن نے اس جوابی حملے کی ناکامی کے بعد گولا باری جاری رکھی۔ شام چار
بجے سے ذرا پہلے دشمن نے گولہ باری میں اضافہ کر دیا۔ زیادہ تر گولہ باری چک پترا
پر کی جا رہی تھی۔ یہ میڈیم توپخانے کی گولہ باری تھی۔ اتنے وزنی گولوں کے دھماکے
جوانوں کے اعصابی نظام کو تباہ کر رہے تھے۔ کسی جوان نے ابھی ایک لمحہ بھی آرام
نہیں کیا تھا۔ چک پترا کی چوٹی کے علاوہ دشمن کا توپ خانہ ان تمام جگہوں پر بھی گولہ باری

کر رہا تھا، جہاں سے ہماری کمک جا سکتی تھی ـــ اس گولہ باری نے پہاڑ کی چوٹی پر
ہمارے جوانوں کو ادھر ادھر چھپ جانے پر مجبور کیے رکھا۔ باہر سر نکالنا خودکشی کے
برابر تھا۔ اس گولہ باری کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے۔ اس کی آڑ میں دشمن نے
تازہ دم بٹالین، نمبر ۴ مہار رجمنٹ پہاڑ پر اس سمت سے چڑھا دی جہاں درخت
ہی درخت ہیں۔ چند گز دور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہمارے جوان جن کی تعداد اب
ایک سو سے بھی کم تھی، گولہ باری سے سر چھپائے ہوئے تھے۔ ان پر پوری بٹالین
جس کی کم از کم نفری آٹھ سو ہوگی حملہ کرنے کے لیے چڑھی آ رہی تھی۔
جب یہ بٹالین صرف ایک سو گز دور رہ گئی تو ہمارے جوانوں کو بھارتی سپاہی
نظر آ گئے۔ انہوں نے گولا باری کی پرواہ نہ کی اور گرنیڈ برسانے شروع کر دیئے۔
بھارتی چوٹی پر آ گئے تھے۔ انہوں نے جم کر لڑنے کی بہت کوشش کی لیکن چڑھائی
نے انہیں ادھ موا کر رکھا تھا۔ وہ جم نہ سکے اور پسپا ہونے لگے۔ ہمارے جوان
مورچوں سے باہر آ گئے اور بھاگتے دشمن کا تعاقب کرنے لگے۔ پیچھے دشمن
کی کئی لاشیں رہ گئیں۔ جو ڈھلان سے بھاگتے ہوئے گرے ان کے بچنے کا
کوئی امکان نہیں تھا۔ ڈھلان کے جنگل میں جو گرنیڈ پھینکے گئے ان سے کئی
بھارتی مرے اور ان پر جو گولا باری کرائی گئی اس سے بھی بھارتیوں کا جانی نقصان
ہوا۔ اس نقصان کا اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ دشمن کا یہ جوابی حملہ معمولی نوعیت کا نہیں
تھا، پوری بٹالین کا حملہ تھا جسے میڈیم بیٹری اور دو فیلڈ بیٹریاں مدد دے رہی تھیں
ـــ اور جس بہادری سے ہمارے جوانوں نے حملہ رد کا وہ بھی معمولی نوعیت
کی بہادری نہیں تھی۔ انہوں نے معجزہ کر دکھایا تھا۔ صرف تین جوان، لانس نائک
محمد رشید، سپاہی علی شان اور سپاہی خان محمد زخمی ہوئے۔

دشمن پسپا ہو رہا تھا مگر پسپا ہوتے ہوتے جانبازوں کی اس کمپنی کو ناقابل
تلافی نقصان دے گیا۔ میجر محمد صابر خان مورچے سے باہر تھے۔ کسی بھارتی نے
ان پر گولی چلائی جو میجر صابر کی ہیلمیٹ سے گذر کر دونوں آنکھوں کے
درمیان سے دماغ میں چلی گئی۔ وہ فوراً ہی شہید ہو گئے۔ آزاد کشمیر فوج
ایک اور تاریخ ساز افسر سے محروم ہو گئی ـــ اب چک پترا کی ساڑھے نو ہزار

فٹ بلند چوٹی پر جہاں میجر محمد صابر خان شہید گرے تھے، ایک یادگار بنی ہوئی ہے جس پر شہید کا وہ ہیلمیٹ رکھا ہے، جس میں سے گولی گزر کر شہید کے سر میں داخل ہوئی تھی۔

میجر صابر شہید کی جگہ کمپنی کی کمان میجر جمشید گلزار نے لے لی۔ ساڑھے پانچ بجے دشمن کا یہ دوسرا حملہ بھی پسپا کر دیا گیا۔ معاً بعد بارش برسنے لگی۔ ہمارے جانباز خاکی قمیضوں میں ملبوس تھے۔ کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ سردی شدید تھی۔ دشمن کی گولہ باری قیامت بپا کیئے ہوئے تھی۔ ہر طرف دشمن کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ خون جو جم گیا تھا بارش سے بہنے لگا۔ چوٹی لال سرخ ہونے لگی۔ اپنے جوان سردی سے کانپ رہے تھے۔ رات کا اندھیرا گہرا ہونے لگا اور رات گزرنے لگی۔ رات بھر دشمن نے گولہ باری جاری رکھی۔ سردی کی شدت اور دھماکوں سے جوان آرام نہ کر سکے۔

اس سارے معرکے کے دوران بیروالی ناڑ پوسٹ جس کی خاطر یہ جنگ لڑی گئی تھی، دشمن کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس پر دشمن گولہ باری کرتا رہا۔ کیپٹن جاوید انور نے گھیرے میں اپنے جوانوں کو نہایت خوبی سے لڑایا۔ وہ ہر طرف فائرنگ کرتے رہے اور دشمن کو قریب نہ آنے دیا۔ وہاں کے جوانوں کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں دو تین روز سے راشن نہیں ملا تھا۔ وہ بھوکے تھے اور ان کا ایمونیشن بھی ختم ہو رہا تھا۔

۶ مئی کی صبح طلوع ہوئی اور آخری مرحلہ شروع ہوا۔ دشمن نے ایک اور چوٹی جو گیارہ ہزار فٹ بلند تھی خالی کر دی تھی۔ نائب صوبیدار فیض نے ایک پلاٹون لی اور اس چوٹی پر چڑھ کر قبضہ کر لیا۔ اب بیروالی ناڑ سے ملاپ LINK UP کرنا تھا۔ یہ کام میجر جمشید گلزار نے سنبھالا۔ ان کے ساتھ صوبیدار محمد اقبال، حوالدار شیر باز، نائک محمد صادق اور پندرہ جوان تھے۔ انہوں نے پہاڑ سے اترنا اور علاقے کو دشمن سے صاف کرنا شروع کیا۔ ڈھلان پر جنگل بہت گھنا ہے۔ وہاں دشمن کے زخمی سپاہی کہیں کہیں پڑے تھے۔ ان میں سے بعض نے میجر جمشید گلزار پر رائفلیں فائر کیں۔ کوئی نقصان تو نہ ہوا لیکن کام کی رفتار سست ہو گئی کیونکہ قدم قدم پر

احتیاط کی ضرورت تھی۔

صوبیدار فیروز الدین کی زیرِ کمان ایک پلاٹون بیروالی ناڑ تک ایمونیشن لے کر گئی اور کیپٹن نیازی چند ایک جوانوں کے ساتھ راشن لے کر گئے۔ یہ سارا سامان خچروں پر لے جایا جا رہا تھا اور دشمن اس علاقے پر توپ خانوں کی گولہ باری کر رہا تھا۔ میجر اشتیاق احمد راجہ جس چوٹی پر تھے، اس کے قریب ایک چوٹی دشمن کی تھی۔ وہاں اس نے مشاہداتی پوسٹیں بنا رکھی تھیں۔ میجر اشتیاق احمد راجہ نے وہ پوسٹیں دیکھ لیں اور ان پر مشین گن فائرنگ کر کے انہیں ختم کر دیا۔ وہاں سے دشمن کے توپ خانے کی راہنمائی ہوتی تھی۔

معرکہ ختم ہو گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید نے بھارتی کرنل چیگاپا سے کہا تھا کہ ہم راستہ کھول لیں گے۔ وہ راستہ کھول لیا گیا۔ اس کے ساتھ دشمن بہت سی زمین بھی دے گیا۔

اس معرکے میں ہماری فوج کے تین افسر، ایک صوبیدار اور اکیس جوان شہید ہوئے اور زخمی ایک صوبیدار اور چوّن جوان۔ یعنی پچیس شہید اور پچپن زخمی۔ بہادری کے صلے میں مندرجہ ذیل اعزازات دیے گئے۔

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید۔ ستارۂ جرأت دوسری بار۔

میجر محمد صابر خان شہید —— ستارۂ جرأت

کیپٹن جاوید انور —— ستارۂ جرأت

صوبیدار محمد صادق شہید —— ستارۂ جرأت

حوالدار نور عالم شہید —— ستارۂ جرأت

صوبیدار محمد یوسف —— ستارۂ جرأت

پسِ پردہ لڑنے والے۔ آرمی سروس کور

جب یہ معرکہ لڑا جا رہا تھا تو فوج کا ایک اور شعبہ اس معرکے میں جان ڈالنے کے لیے اپنی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس شعبے کا ذکر جنگوں کی تاریخ میں کم

ہی آتا ہے۔ اسے آرمی سروس کور کہتے ہیں۔ اس شعبے کی ایم ٹی (موٹر ٹرانسپورٹ)
پلاٹون کے کمانڈر لاہور کے رہنے والے کیپٹن احمد انور تھے۔ ان کے پاس
صرف جیپیں تھیں۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ اگلے مورچوں کو راشن، ایمونیشن اور
دیگر سامان سپلائی کرتے رہیں۔ یہ سامان انہیں لیپا ڈپلی سے بہت ہی دور نیچے
سے لانا پڑتا تھا۔ جنگ کے دوران لیپا تک جانے والا راستہ اتنا چوڑا نہیں
تھا اور راستہ برف تلے دبا ہُوا تھا۔ جب دشمن نے ۴ مئی کے روز حملہ کیا تو
کیپٹن احمد انور کو لیپا تک ایمونیشن وغیرہ پہنچانے کا حکم ملا کیونکہ خطرہ تھا کہ جنگ لمبی
ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں ایمونیشن کی وافر مقدار کا آگے رکھنا لازمی تھا۔

کیپٹن انور نو جیپیں ایمونیشن سے لاد کر چلے۔ رات کا وقت تھا۔ برف
تلے راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ راستہ میدانی نہیں بلکہ پہاڑوں پر ہر چند قدم پر گھوم
گھوم کر چڑھ رہا تھا۔ راستہ کچا بھی تھا۔ برف کی وجہ سے پھسلن اتنی کہ گاڑیاں کسی
بھی جگہ پھسل کر دور نیچے جا پڑتیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ کہ گاڑیوں کی بتیاں روشن
نہیں کی جا سکتی تھیں ورنہ دشمن کی گھات کا خطرہ تھا۔ تیز نہیں چلا جا سکتا تھا اور
راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا یہ علاج کیا گیا کہ کیپٹن انور اگلی جیپ کے بونٹ یعنی
انجن پر بیٹھ گئے اور راستہ دیکھ دیکھ کر ڈرائیور کو ہدایات دیتے گئے۔ کئی جگہوں پر انہیں اتر
کر جیپ کے آگے آگے چلنا پڑا۔ ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کوئی نہ کوئی گاڑی پھسل کر
گر پڑے گی۔ میں اس راستے کو تفصیل سے بیان کر چکا ہُوں۔ ایسے راستے پر
روشنی کے بغیر گاڑی چلانا اور وہ بھی برف پر کس قدر خطرناک تھا، تصوّر کیا جا سکتا
ہے۔

وہ ایمونیشن لے کر لیپا وادی میں پہنچے تو ہماری طرف سے جوابی حملہ شروع
ہو رہا تھا۔ مارٹر بیٹری کے گن پوزیشن آفیسر تحصیل مری کے گاؤں ملوٹ ستیاں کے
رہنے والے نوجوان کیپٹن رب نواز تھے۔ جیپوں میں مارٹر گنوں کا ایمونیشن تھا جو
گنوں کی پوزیشن تک پہنچانا تھا۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ بہت بڑے
بڑے پتھر تھے یا ندی اور درخت تھے۔ وہاں کیپٹن رب نواز جیپوں کے آگے
چل کر بڑی ہی دشواری سے گن پوزیشن تک لے کر گئے اور جب فائرنگ

شروع ہوگئی تو مارٹر گنوں کا ایمونیشن تیزی سے ختم ہونے لگا۔ کیپٹن رب نواز
نے کیپٹن احمد انور سے کہا کہ صرف پچھتر راؤنڈ رہ گئے ہیں جو تھوڑی دیر بعد ختم
ہو جائیں گے۔ ممکن نہیں تھا کہ ایسے دشوار پہاڑی راستے سے رات کے وقت
اتنی دُور سے اتنی جلدی ایمونیشن بروقت پہنچایا جاتے۔

کیپٹن رب نواز بھی جانتے تھے کہ وہ کیپٹن احمد انور کو ایک ناممکن کام کرنے
کو کہہ رہے ہیں۔ کیپٹن احمد انور نے وعدہ کیا کہ وہ ایمونیشن ضرور لائیں گے۔ وہ
اسی وقت جیپیں لے کر گئے اور تاریکی میں جان کا خطرہ مول لے کر برف پر پھسلتے
بائیس میل کا فاصلہ آٹھ گھنٹوں میں طے کر کے مارٹر گنوں کے لیے ایمونیشن لے
آئے۔ ۵ مئی کی رات بھی کیپٹن احمد انور نے ایمونیشن آگے پہنچایا۔ ان کے
ڈرائیوروں نے بھوک پیاس سے ایسی خطرناک ڈرائیونگ لگاتار کی اور محاذ پر
ایمونیشن کم نہ ہونے دیا۔ وہ جب پہاڑوں پر جا رہے تھے تو دشمن ان پر گولہ باری
بھی کر رہا تھا۔

اس شعبے کو سب سے بڑے جس خطرے کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ
ہے کہ انہیں رات کے وقت اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔ دن کے وقت دشمن
کے طیارے انہیں راستے میں ہی ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنگل کی
لڑائی میں دشمن گھات لگا کر انہیں راستے میں ہی تباہ کر دیتا ہے۔ یہ علاقہ گوریلا
اپریشن کے لیے نہایت موزوں ہے۔ ۱۰/۹ دسمبر ۱۹۷۱ کی درمیانی رات
جب جنگ دسمبر لڑی جا رہی تھی، کیپٹن احمد انور بارہ جیپوں کا کنوائے ایمونیشن
سے لدا ہُوا لیپا وادی کی بھوار گلی سے گزر رہے تھے۔ وقت آدھی رات کا تھا۔
یہاں راستہ بلندی پر ہے اور چیل اور دیودار کے گھنے جنگل سے گزرتا ہے۔
ایک مقام پر دشمن گھات میں بیٹھا تھا۔ ان پر دشمن نے فائر کھول دیا لیکن ڈرائیوروں
نے سٹین گنوں سے مقابلہ کیا۔ ان کے ساتھ آزاد کشمیر کی ایک بٹالین کے کچھ جوان
تھے۔ انہوں نے بھی مقابلہ کیا اور دشمن کوئی نقصان کیے بغیر بھاگ گیا۔ فائر بندی
کے بعد بھارت کی نمبر ۹ سکھ رجمنٹ کے ایک افسر میجر بھالو رام نے آزاد کشمیر
کے ایک افسر کو بتایا تھا کہ یہ گھات اس نے ایک پلاٹون کی نفری سے لگائی تھی۔

اس نے ہمارے ڈرائیوروں اور دوسرے جوانوں کی تعریف کی جنہوں نے نہایت تیزی سے جوابی فائر کر کے گھات کو ناکام کیا تھا۔

یہ ہے لیپا وادی کے معرکے کی کہانی جسے بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے خوب اچھالا ہے اور بہت جھوٹ بولے ہیں۔ پاکستان میں بھی لیپا وادی کو بہت شہرت اور اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے یہ تاثر عام ہو گیا ہے کہ لیپا وادی دشمن کو دی جا رہی ہے حالانکہ یہ صرف دو تین پوسٹوں کا لین دین ہے۔ اصل تنازعہ یہ تھا کہ ہماری بیرو والی نار پوسٹ کو سپلائی کا راستہ مل جائے۔ دشمن نے اس راستے کو بند کر دیا جب کہ چھ مہینوں سے یہ راستہ کھلا تھا۔ راستہ کھولنے کے لیے دشمن سے بلند پوسٹیں چھین لی گئیں۔ اب اگر دشمن راستہ دے دیتا ہے تو اسے کچھ واپس کر دیا جائے گا اور کچھ لے لیا جائے گا لیکن ساری کی ساری لیپا وادی دشمن کو نہیں دی جائے گی۔

ہمارے دشمن کو یہ تکلیف بھی پہنچ رہی ہے کہ وہ ہمارا علاقہ ہتھیانے کی کوشش میں اپنا علاقہ دے بیٹھا ہے۔ وہ ہماری گھری ہوئی پوسٹ، بیرو والی نار کو ہماری دکھتی رگ سمجھ کر ہمیں لین دین پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وادی میں ہماری نفری خاصی کم ہے جو اس کی باقاعدہ پلٹنوں اور بے پناہ توپخانے کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں، مگر ہمارے گنتی کے چند ایک جانبازوں نے اس کی جنگی قوت کو ساڑھے نو ہزار فٹ بلندی سے لڑھکا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور بیرو والی نار اس کی اپنی دکھتی نار (رگ) بن گئی۔ بھارت کے فوجی کمانڈر دراصل دو تین پوسٹیں نہیں بلکہ اپنا وہ وقار جو وہ لڑ کر کھو بیٹھے ہیں کانفرنس کی میز پر واپس لینا چاہتے ہیں۔

لیپا وادی اور اس کی متنازعہ پوسٹوں کا مستقبل خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ۴/۵ مئی ۱۹۷۲ء کے معرکے کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ اس معجزہ نما معرکے میں فوج نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ پہلے بھی نہیں ہاری تھی، اب بھی نہیں ہارے گی۔ مجھے کئی افسروں اور جوانوں نے کہا ہے ——— "ہمیں ذرا آزادی سے لڑنے تو دو۔ پھر ہم قوم کے سارے شکوک رفع کر دیں گے۔"

مورال کا معرکہ لڑنے والے

چونڈہ سیکٹر میں پھلورا کے قریب ایک کھیت میں پہلو بہ پہلو گیارہ پکی قبریں ہیں۔ ان کی ساخت اور شکل ایک ہی جیسی ہے۔ یہ ہماری نمبر ۹ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ یہ پیادہ جوان تھے۔ ٹینکوں سے لڑتے شہید ہوئے تھے۔ جنگ اتنی گھمسان کی تھی کہ لاشیں پیچھے نہ لائی جا سکیں۔ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا۔ فائربندی کے بعد ان کی یونٹ نے قبریں سیمنٹ سے "پکی" کر دیں۔ اس دیہاتی علاقے میں یہ قبریں "رومالاں والیاں قبراں" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان میں سے ایک شہید کی بیوہ فائربندی کے بعد اپنے شہید خاوند کی قبر پہ آئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریشمی رومال لائی تھی۔ اس نے ایک کانا (سرکنڈا) کہیں سے لا کر قبر کے سرہانے زمین میں گاڑا اور اس پر جھنڈے کی طرح رومال باندھ دیا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ رومال اسے خاوند نے شادی کے موقع پر دیا تھا۔

وہ چلی گئی تو باقی دس شہیدوں کے ساتھیوں نے (جو اپنی یونٹ کے ساتھ ابھی اسی علاقے میں مورچہ بند تھے) سیالکوٹ سے دس ریشمی رومال منگوائے اور ہر ایک قبر کے سرہانے کانے گاڑ کر رومال باندھ دیئے۔ یہ رومال ایک عرصے تک قبروں پر لہراتے رہے پھر ہوا، دھوپ اور بارش سے ان کے رنگ اڑے پھر رومال پھٹنے لگے اور پھر بالکل ہی غائب ہو گئے لیکن اپنے پیچھے قبروں کو یہ نام دے گئے ——— "رومالاں والیاں قبراں"۔

یہ کہانی اسی یونٹ اور اس کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ایم۔ اے
مجید کی ہے۔ کرنل مجید کہتے ہیں:

"چونڈہ کا میدان جہنم بنا ہوا تھا۔ میں کماد کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔
مجھے ڈھونڈنے یا مارنے کے لیے دشمن کھیت میں مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر
کر رہا تھا۔ گولیاں میرے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ دشمن کا ایک ٹینک کھیت
کے کنارے پر آن کھڑا ہوا۔ میں زخمی تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کماد سے نکل
کر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دوں . . . 'نہیں۔ یوں نہیں ہوگا۔ میں
بٹالین کمانڈر ہوں۔ میں پاک فوج کا کرنل ہوں'—— میں نے ارادہ بدل لیا اور
دشمن کی مشین گن کے اُس برسٹ کا انتظار کرنے لگا جسے میرے جسم سے پار ہونا
تھا۔"

چونڈہ کے تاریخی میدانِ جنگ میں دشمن کے ایک شدید حملے میں ان
کی بٹالین بکھر گئی تھی اور ان کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میدانِ جنگ
کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ کوئی بتا نہیں سکتا تھا کہ دشمن کہاں کہاں تک پہنچ گیا
ہے اور اپنی بکھری ہوئی کمپنیاں اور پلاٹونیں کہاں کہاں دشمن کے گھیرے میں
آ گئی ہیں۔ کرنل مجید رات کے اندھیرے میں پیچھے آنے لگے۔ پھلورا کے
چوراہے پر آ کر انہوں نے جن دو فوجیوں سے راہنمائی لینے کے لیے بات کی
وہ انڈین آرمی کے فوجی تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے کرنل مجید بھارتیوں کی وردی
کا رنگ نہ پہچان سکے۔ بھارتیوں نے انہیں پہچان لیا۔ وہاں سے کرنل مجید کے
فرار اور تعاقب کی ایک ناقابلِ فراموش مہم شروع ہوئی۔ ان کے چاروں طرف
دشمن تھا۔ میدان دشمن کے ہاتھ تھا۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اپنے
بالائی ہیڈکوارٹر کو کرنل مجید کے متعلق یہ رپورٹ دے دی گئی تھی کہ وہ شہید
ہو گئے ہیں۔

یہ داستان سنانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پس منظر اور
چونڈہ کے میدانِ جنگ کی اُس وقت کی کیفیت بیان کر دی جائے۔ "حکایت"
شمارہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں چونڈہ میں لڑنے والے ہمارے بکتر بند ڈویژن کے کمانڈر

میجر جنرل ابرار حسین کا انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں چونڈہ کی جنگ کو تفصیل سے
بیان کیا گیا ہے۔ انٹرویو کے دوران ان سے پوچھا گیا تھا——"دوسری
جنگِ عظیم میں ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ بن غازی اور العالمین میں
جرمن جرنیل رومیل اور اتحادی جرنیل منٹگمری نے لڑی تھی۔ کیا آپ نے ان کی
چالوں کا مطالعہ کیا تھا اور ان سے چونڈہ کی جنگ میں کچھ فائدہ اٹھایا تھا؟"

جنرل ابرار حسین نے جواب دیا تھا——"میں نے رومیل اور
منٹگمری کو کبھی ایسا مثالی جرنیل نہیں سمجھا تھا کہ چونڈہ میں ان کی چالوں کی نقل کرتا۔ انہوں
نے جنگی ساز و سامان اور اسلحہ بارود کی افراط کے بل بوتے پر جنگ لڑی تھی۔ ان
کے پاس اتنے لڑاکا بمبار طیارے تھے جن کے پیچھے سورج چھپ جاتا تھا۔
جنرل منٹگمری نے کہا تھا کہ ہم BATTLE OF MATERIAL (جنگی ساز و سامان
کی لڑائی) لڑیں گے۔ مگر چونڈہ میں میرے پاس ایسی افراط کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔
دشمن کے ٹینکوں کی تعداد ہمارے ٹینکوں سے چار گنا زیادہ تھی۔ پیادہ فوج کا
تناسب یہ تھا کہ دشمن کی پچاس ہزار نفری کے مقابلے میں میرے پاس کل نفری نو
ہزار تھی۔ توپ خانے کا تناسب بھی یہی تھا۔ میری ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ مجھے
متعدد یونٹیں چھمب جوڑیاں کے محاذ کی تھکی ہوئی ملی تھیں جن کی نفری زخمیوں اور
شہیدوں کی وجہ سے کم تھی۔ میرے مقابلے میں دشمن جو بکتر بند اور پیادہ ڈویژن
لایا تھا وہ تازہ دم تھے۔ ان حالات میں . . ."، جنرل ابرار حسین نے کہا
——"مجھے اللہ کے بھروسے، اپنی فہم و فراست کے بھروسے اور افسروں
اور جوانوں کے جذبے کے بھروسے پر لڑنا تھا۔ مجھے نفری کم ہونے کی توقع
تھی۔ کمک کی کوئی اُمید نہیں تھی نہ ہمارے پاس کمک تھی۔ لہٰذا مجھے ایک
بریگیڈ کے مقابلے میں ایک بٹالین اور ٹینک رجمنٹ کے مقابلے میں ایک
سکواڈرن بھیجنا پڑتا تھا۔ یعنی مجھے BATTLE OF MATERIAL نہیں بلکہ
BATTLE OF MORALE لڑنی پڑی۔"

پاک فوج کو گزشتہ پچیس برسوں کے دوران جہاں بھی لڑایا گیا وہاں
یعنی جذبے کے زور پر لڑایا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر محاذ پر، ۱۹۶۵ء میں رن کچھ

میں اور فوراً بعد جنگِ ستمبر کے سولہ سو میل لمبے محاذ پر اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی محاذ پر پاک فوج، فضائیہ اور بحریہ کو ایسے کڑے امتحان میں ڈالا گیا جس کی مثال شاید عالمی جنگوں کی تاریخ میں بھی نہ ملے۔ یہ صحیح ہے کہ جذبہ نہ ہو تو جنگ نہیں لڑی جا سکتی لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ جنگ صرف جذبے سے لڑی جا سکتی ہے۔ لڑی تو جا سکتی ہے، جیتی نہیں جا سکتی۔ دشمن کے مقابلے پر پورا اُترنے کے لیے جب تک نفری اور اسلحہ بارود کافی نہ ہو صرف جذبہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب میٹریل کے مقابلے میں مورال لڑایا جاتا ہے تو یوں ہوتا ہے کہ میٹریل والے ایک ٹینک آگے کرتے ہیں اور مورال والے ایک انسان آگے کرتے ہیں۔ یہ انسان مورال کے زور پر ٹینک سے ڈرتا نہیں، راکٹ لانچر کندھے پر رکھ کر ٹینک کے سامنے چلا جاتا ہے۔ پھر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس جوان کے لانچر سے راکٹ پہلے نکلتا ہے یا ٹینک کی مشین گن سے برسٹ پہلے نکلتا ہے۔ انگلی جس کی ایک ثانیہ پہلے حرکت میں آگئی اس نے یہ معرکہ جیت لیا۔ یا ٹینک نہیں یا جوان نہیں یا دونوں ہی نہیں۔ اِدھر سے راکٹ نکلا اُدھر سے برسٹ نکلا۔ اس کے بعد میٹریل والے برباد شدہ ٹینک کی جگہ نیا ٹینک لے آتے ہیں لیکن مورال والوں کے پاس دوسرا جوان اور دوسرا راکٹ لانچر نہیں ہوتا۔

اس طرح افسر اور جوان جذبے کی شدّت سے نعرے لگاتے کئی گنا طاقتور دشمن سے ٹکرا جاتے ہیں۔ زخمی ہوتے، جانیں دیتے اور تیزی سے ختم ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ معرکے اور لڑائیاں تو جیت لیتے ہیں، مجموعی طور پر جنگ نہیں جیت سکتے۔ مشرقی پاکستان میں ہماری شکست کی وجہ یہی تھی۔

جب کم نفری اور ناکافی اسلحہ بارُود سے جذبے کی جنگ لڑی جاتی ہے تو لڑنے والوں کو ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ لڑنے والوں کا جو حشر ہوتا ہے اس کی ایک مثال کرنل مجید اور ان کی نمبر ۹ ایف ایف کی ہے۔

۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بھارت کے آرمرڈ (ٹینک) ڈویژن نے تین غیر بکتر بند اور ایک موٹر بریگیڈ کے ساتھ سیالکوٹ سیکٹر پر حملہ کیا۔ بکتر بند ڈویژن کا پہلا مقابلہ ہمارے ایک پیادہ بریگیڈ نے کیا جس کے ساتھ کرنل (اب بریگیڈیئر) نثار کی صرف ایک ٹینک رجمنٹ تھی۔ دشمن کو توپخانے کی ساڑھے چار سو فیلڈ اور میڈیم توپوں کی مدد حاصل تھی۔ یہ دشمن کی کور آرٹلری تھی۔ پاک فوج کو بھی یہاں کور آرٹلری کی ضرورت تھی مگر وہ چھمب جوڑیاں کے محاذ پر تھی۔ سیالکوٹ سیکٹر میں جو توپ خانہ تھا وہ اتنے بڑے حملے کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا تھا۔

پاک فوج کے پاس پلّے جو کچھ تھا اسی سے لڑتا تھا، اور لڑنے والوں کو اللہ کے بھروسے، جذبے کے زور پر لڑنا تھا۔ یہ ذمہ داری تو اُن حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے یہ پلان بنا لیا تھا کہ کشمیر میں کمانڈو داخل کیے جائیں پھر چھمب سیکٹر میں حملہ کر کے اکھنور پر قبضہ کیا جائے اور کشمیر کو سر بمہر کر دیا جائے۔ ہمارے حکمرانوں نے پلان تو بنا لیا تھا لیکن جس ملک کے ساتھ انہوں نے ٹکر لی تھی اس کی جنگی طاقت کے مطابق اپنی طاقت میں اضافہ نہ کیا اور نہ اپنے سٹور دیکھے کہ ان میں گولا بارُود کتنا کچھ ہے اور نہ یہ سوچا کہ گوشت پوست کے یہ انسان محض جذبے کے زور پر کتنے دن لڑ سکیں گے۔

اس پلان سے قطع نظر بھارت کے عزائم ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی بھارت نے پاکستان کے وجُود کو ختم کرنے کے جتن شروع کر دیئے تھے۔ بھارت سے مسلمانوں کا انخلا۔ ہمارے حصے کا اسلحہ بارُود اور روپیہ روک لینا۔ کشمیر پر کھلا حملہ۔ افغانستان کو اپنے فوجی افسر دے کر افغان لشکروں سے بلوچستان اور صوبہ سرحد پر حملے کرانا۔ سندھ میں جنگی نوعیت کی سی کارروائیاں سرحدی جھڑپوں کو جاری رکھنا۔ پاکستان کو ختم کرنے کی دھمکیاں دیتے رہنا۔ رن کچھ میں ہمیں للکارنا پھر پاکستان پر کھلا حملہ اور اس کے بعد مشرقی پاکستان میں تخریبی سرگرمیاں۔ معاہدے کرتے رہنا اور توڑتے رہنا اور اپنی جنگی قوت کو بڑھاتے چلے جانا۔

بھارت کے سیاسی اور فوجی لیڈروں کے بیانات اور سرگرمیوں کے

پیشِ نظر اور اس کی جنگی قوت میں اضافے کو دیکھتے ہوئے بھی ہمارے حکمرانوں نے اپنی افواج میں اتنا اضافہ نہ کیا جتنا بھارت کی طرف سے بلکہ بھارت کی پشت پناہی میں افغانستان کی طرف سے بھی) خطرہ تھا۔ اضافہ تو دُور کی بات ہے ہمارے ایک وزیرِاعظم ایسے بھی آئے تھے جنہوں نے ۵۳-۱۹۵۲ء میں یہ جواز پیش کر کے افواج میں کمی کر دی تھی کہ ملک اتنے زیادہ اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اُسی دَور میں قومی اسمبلی میں وزیرِ خزانہ نے کہا تھا کہ ہماری فوج سفید ہاتھی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ حکمران اور وزراء خود سفید ہاتھی بنے ہوتے تھے۔ ان کے غیر ملکی دوروں اور دیگر عیاشیوں پر اتنا خرچ اُٹھ جاتا تھا کہ ملک کے دفاع کے لئے کچھ نہیں بچتا تھا۔ پھر ایوب خان آیا تو اس نے فوج کو سیاست کا مُہرہ بنا دیا۔ اپنی بادشاہی کے تحفظ کے لیے جرنیلوں کو شہزادے بنانے کی ترکیبیں کیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے اس حکمران کو بھارت سے نہیں اپنی قوم سے خطرہ ہے۔

ہمارا پڑوسی پاکستان کو ختم کرنے کا عزم لیے ہوئے جنگی تیاریوں میں مصروف رہا۔ یہ تو پاکستان کی خوش نصیبی ہے کہ ہماری مسلح افواج میں پاکستان کی اتنی محبت ہے کہ وقت آیا تو جان پر کھیل کر پاکستان کا دفاع کیا۔ ہم نے اپنے جانبازوں کی شجاعت اور شوقِ شہادت کے گیت لکھے، ترانے گائے، کہانیاں سُنیں اور سنائیں اور اگلی جنگ لڑنے کے لئے فوج کو بارکوں میں بھیج دیا مگر یہ کبھی بھی نہ سوچا کہ پاک فوج کا سپاہی انسان ہے۔ آسمان سے اُترا ہُوا سُپرمین نہیں اور ہمارے بادشاہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہم نے اپنی فوج کو جب بھی لڑایا ہے جذبے کے زور پہ لڑایا ہے بلکہ بھارت کی اور اپنی جنگی قوت اور نفری کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اپنے سپاہی کو بے تیغ لڑایا ہے۔

جذبہ قابلِ قدر ہی سہی لیکن ذرا دیکھئے کہ انسانوں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی سحر دشمن نے چونڈہ سیکٹر میں بکتر بند ڈویژن سے حملہ کیا تو اس کا مقابلہ ہمارے پیادہ بریگیڈ نے کیا۔ اس کے ساتھ صرف ایک ٹینک رجمنٹ تھی۔ یہ پیادہ بریگیڈ تین دن اور راتیں لڑتا رہا۔ ایک فرنٹیئر فورس بٹالین بُری طرح کُچلی گئی

مگر پیچھے نہ ہٹی۔ اپنے ٹینک سواروں اور جوانوں نے حیران کُن شجاعت کے مظاہرے کیے۔ ان کی تفصیلات "حکایت" کے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں سنائی جا چکی ہیں۔ اس بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیئر (اب لیفٹیننٹ جنرل) عبدالعلی ملک تھے۔ وہ گھبرائے نہیں۔ افسروں اور جوانوں نے انہیں مایوس نہ کیا۔ انہوں نے قوم کو بھی مایوس نہ کیا۔ اتنے میں میجر جنرل ابرار حسین آرمرڈ ڈویژن لے کر میدان میں آ گئے لیکن یہ ڈویژن نہیں بلکہ ٹینکوں کا ایک بریگیڈ تھا۔ بمشکل ڈیڑھ سو ٹینک تھے۔ انہیں اس دشمن کے مقابلے کے لیے میدان میں اُتارا گیا تھا جس نے تقریباً پانچ سو ٹینکوں سے حملہ کیا تھا اور اس کے پاس اس سے دُگنے ٹینک ریزرو میں تھے۔ اپنے پاس ریزرو کا یہ عالم تھا کہ دوسرے محاذوں سے ٹینک نکال کر چونڈہ بھیجے گئے۔ کھیم کرن اور لاہور جیسے نازک محاذوں کو کمزور کر کے وہاں سے چونڈہ کے لیے ٹینک نکالے گئے۔

جنرل ابرار حسین نے بریگیڈیئر عبدالعلی ملک کے بریگیڈ کی حالت دیکھی تو اسے ستانے کا موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ دشمن کی حالت اور محاذ کے پھیلاؤ کے مطابق وہاں بریگیڈ سے زیادہ قوت بھیجنی چاہیئے تھی لیکن بریگیڈ کی جگہ صرف ایک پلٹن اور ایک ٹینک رجمنٹ آگے بھیجی گئی۔ اس کے کمانڈر کرنل [illegible] تھے۔ یہ ٹینک رجمنٹ چھمب کے حملے میں شامل تھی یعنی یکم ستمبر سے لڑ رہی تھی، اُس محاذ سے اس رجمنٹ کو چونڈہ بھیجا گیا۔ ظاہر ہے کہ افسر اور جوان تھکے ہوئے تھے۔ نقصان بھی اُٹھا چکے تھے۔ ان میں لڑنے کی اہلیت اور جذبہ تو تھا لیکن پہلے روز والا دم خم نہیں رہا تھا۔

اور فرنٹیئر فورس کی نویں بٹالین جو آگے بھیجی گئی اس کے کمانڈر کرنل ایم۔ اے۔ مجید تھے۔ اس بٹالین کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ اپنے ٹینکوں کے دوش بدوش ٹینکوں کے خلاف لڑنے والی بٹالین تھی۔ یہ اس کا خصوصی رول تھا۔ اس رول کے لیے یہ بٹالین بکتر بند گاڑیوں میں ہونی چاہیئے تھی جنہیں اے۔ پی۔ سی ARMOURED PERSONNEL CARRIER کہا جاتا ہے مگر اس کے پاس ایک بھی بکتر بند گاڑی نہیں تھی بلکہ انہیں اڑھائی ٹن ٹرک دیئے گئے تھے جو اُس میدانِ جنگ کے لیے کسی پہلو موزوں نہیں تھے جہاں ٹینکوں کی جنگ لڑی جا رہی تھی، گولا باری بارش

کی طرح ہو رہی تھی اور طیارے چیلوں کی طرح فضا میں منڈلا اور جھپٹ رہے تھے۔
اس بٹالین کے پاس ٹینک شکن گنوں (آر آر) والی ستائیس جیپیں ہونی چاہئیں تھی لیکن وہاں کُل پندرہ جیپیں تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بٹالین پیادہ پلٹنوں کی طرح چار رائفل کمپنیوں کی نہیں بلکہ تین کمپنیوں کی تھی لیکن بکتر بند گاڑیاں نہ ہونے کی وجہ سے یہ محض پیادہ پلٹن تھی جسے ادھوری پیادہ پلٹن کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا ـــــ اس ادھوری پیادہ پلٹن کو ایک تھکی ہوئی ٹینک رجمنٹ کے ساتھ آگے انڈین آرمی کی نہ جانے کتنی ٹینک رجمنٹوں کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا اور اس توقع پر بھیجا گیا کہ افسر اور جوان جذبے کے زور پر لڑیں گے۔

جنگی لحاظ سے یہ یقیناً غلطی تھی کہ اس قسم کی نامکمل پیادہ بٹالین اور کرنل عزیز کا تھکی ہوئی اور کم نفری کی ٹینک رجمنٹ کو ایک بریگیڈ کی جگہ ٹینکوں کی جنگ میں جھونکا گیا لیکن یہ غلطی ڈویژن کمانڈر کی نہیں تھی۔ جنرل ابرار حسین کو اسی طاقت سے کام لینا تھا جو انہیں دی گئی تھی۔ ہر ایک یونٹ کسی نہ کسی جگہ لڑ رہی تھی۔ دشمن محاذ پھیلاتا جا رہا تھا اور اپنی فوج کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی ذرا سی قوت سے کچھ یونٹیں ایک کر کے جنرل ابرار حسین نے ٹاسک فورس (محفوظہ) بھی تیار کی تھی جو دشمن پر جوابی حملے کے لیے اور شدید ضرورت کے وقت ضرورت کے مقام پر پہنچنے کے لیے پا برکاب رکھی جاتی ہے۔ یہ میدانِ جنگ کی ایک ایسی ضرورت ہوتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ فوج کسی اور ملک کی ہوتی تو ڈویژن کمانڈر بالائی کمان سے یہ ضرور کہتا کہ اس کے پاس نفری اور ٹینک خطرناک حد تک کم ہیں اور خطرہ یہ ہے کہ دشمن اپنی بکتر بند قوت کی افراط سے ہماری اس ذرا جتنی فورس کو کچلتا ہوا آگے نکل جائے گا مگر چونڈہ میں کسی نے شکایت نہ کی بلکہ یہاں تک ہوا کہ اس سیکٹر میں پہلے روز میجر جنرل اسماعیل جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے۔ انہوں نے جب دشمن کی اور اپنی طاقت کا تناسب دیکھا تو انہوں نے بریگیڈیئر (اب لیفٹیننٹ جنرل) عبدالعلی ملک کو حکم دے دیا کہ وہ پیچھے ہٹ آئیں، سیالکوٹ کو خالی کر دیا جائے اور بہت پیچھے جا کر لڑا جائے۔
جنرل عبدالعلی ملک نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی جنرل اسماعیل

کے ساتھ تُو تُو مَیں مَیں بھی ہوئی۔ آخر جنرل عبدالعلی ملک نے صاف کہہ دیا کہ دشمن ہماری لاشوں سے گزر کر سیالکوٹ تک پہنچے گا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنرل عبدالعلی نے ریوالور نکال لیا تھا۔ یہ رپورٹ اسلام آباد پہنچی تو جنرل اسماعیل کو اس سیکٹر سے ہٹا دیا گیا اور وہاں جنرل ٹکا خان (سیالکوٹ سیکٹر) اور جنرل ابرار حسین (چونڈہ سیکٹر) کو بھیجا گیا۔ بکتر بند ڈویژن کی کمان جنرل ابرار حسین کے پاس تھی۔ یہ ان کا عزم اور جذبہ تھا کہ انہوں نے وہیں لڑنے کا فیصلہ کیا۔

کرنل مجید کی بٹالین ۹ ستمبر کے روز چونڈہ سیکٹر میں پہنچی۔ اس سے پہلے یہ بٹالین مختلف جگہوں پر استعمال ہوتی رہی تھی۔ چونڈہ سیکٹر میں اسے ظفروال چونڈہ روڈ کی حفاظت پر لگا دیا گیا۔ چونڈہ کی جنگ کا یہ دُوسرا دن تھا۔ جنرل عبدالعلی کا بریگیڈ آگے لڑ رہا تھا۔ کرنل مجید آگے جا کر جنرل عبدالعلی سے ملے اور انہیں صورتِ حال سے مطمئن پایا حالانکہ یہ بریگیڈ حملہ روکنے کی بہت بڑی قیمت ادا کر چکا تھا۔ ہر لمحہ یہ توقع تھی کہ دشمن ٹینکوں کی افراط کے زور پر ظفروال چونڈہ روڈ تک آ جائے گا۔ اس وقت پھلورا اپنے لڑدپس کے پاس تھا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کرنل مجید نے سڑک کے ساتھ اپنی تینوں کمپنیوں کو ڈیپلائے کر دیا۔ ان کے سیکنڈ ان کمانڈر میجر منصور تھے اور کمپنی کمانڈر میجر اکابر حسین، میجر اصغر لبھ اور میجر حمید تھے۔

۱۰ ستمبر کے روز اپنا بکتر بند ڈویژن ایکشن میں آ گیا۔ شام کے وقت کرنل مجید کو گیارھویں کیولری کے کمانڈنگ افسر کرنل عزیز کا وائرلیس پیغام ملا۔ وہ انہیں ملنا چاہتے تھے۔ طے ہُوا کہ کرنل مجید چونڈہ گاؤں میں پہنچ جائیں۔ کرنل مجید نے ڈرائیور اور وائرلیس اپریٹر کو ساتھ لیا اور جیپ میں چونڈہ گاؤں میں گئے۔ رات کا وقت تھا۔ وائرلیس پر کرنل عزیز کو پکارا۔ وہ انہیں مل گئے۔ کرنل عزیز نے انہیں کہا ـــــ "ہمیں بریگیڈیئر عبدالعلی ملک کے بریگیڈ کی جگہ لینی ہے۔ بریگیڈ پیچھے جا رہا ہے" ـــــ کرنل مجید کو سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ جہاں تین پلٹنیں لڑ رہی تھیں وہاں ان کی صرف ایک ایک بٹالین جا رہی ہے اور دشمن کی نفری پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جہاں چار چار کمپنیاں لڑ رہی تھیں وہاں صرف

ایک ایک کمپنی لڑ سکے گی؟ —— انہوں نے ممکن اور ناممکن کا خیال دل سے نکال دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک بریگیڈ کی جگہ دوسرا پورا بریگیڈ کہاں سے آئے گا۔ جو کچھ ہے وہ یہی ہے، تین کمپنیوں کی ایک بٹالین اور چھمب جوڑیاں کی تھکی ماندی اور ادھوری سی ٹینک رجمنٹ۔ سوال اپنے بادشاہوں کی حفاظت کا نہیں پاکستان کی بقا کا تھا۔ پاکستان کا وقار تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر کھڑا تھا۔

کرنل مجید نے کرنل عزیز کو پھلورا بھیج دیا جہاں جنرل عبدالعلی کا بریگیڈ ہیڈکوارٹر تھا اور وہ خود واپس گئے۔ اپنے تینوں کمپنی کمانڈروں کو بلا کر جلدی جلدی نیا حکم سنایا اور آگے جانے کے لیے کوچ کا حکم دیا۔ وہ خود پھلورا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے لیے نفری کی کمی کے علاوہ ایک بڑی دشواری یہ بھی تھی کہ علاقے سے واقف نہیں تھے نہ انہیں وہ زمین دیکھنے کا موقع ملا تھا جہاں انہیں لڑنا تھا۔ لڑنے والوں کے لئے زمین کے نشیب و فراز سے واقف ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ جنرل عبدالعلی سے اور ان کے یونٹ کمانڈروں سے زمین کے متعلق اور دشمن کی پوزیشنوں کے متعلق زبانی معلومات حاصل کریں مگر کرنل مجید جب پھلورا کی طرف جا رہے تھے تو آگے سے یونٹیں واپس آ رہی تھیں۔ محاذ خاموش تھا۔ تین دنوں کی جنگ میں دشمن نے بھی بہت نقصان اٹھایا تھا اور وہ اب "ری گروپنگ" میں مصروف تھا۔ محاذ کی یہ خاموشی بڑی ہی خطرناک ہوا کرتی ہے۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ اس خاموشی سے کیسا طوفان اٹھے گا۔

کرنل مجید رات آٹھ بجے پھلورا کے ریسٹ ہاؤس میں جنرل عبدالعلی سے ملے۔ کرنل عزیز بھی وہیں تھے۔ کرنل مجید نے جنرل عبدالعلی سے زمین اور دشمن کے متعلق پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ دشمن تقریباً ڈیڑھ میل دور چوبارہ گاؤں اور گردونواح میں ہے۔ جنرل عبدالعلی نے انہیں یہ بھی بتایا کہ گڈگور کے شمال میں ایک وسیع ٹیلا ہے جو اپنے پاس ہے۔ یہ ایک اہم اور کارآمد بلند مقام ہے اس پر فوراً قبضہ کریں —— انہیں باقی پوزیشنیں نقشے پر بریگیڈ میجر نے دکھائیں۔ یہ پوزیشنیں ایک پوری پلٹن کی تھیں لیکن اب وہاں ایک ایک کمپنی جا رہی تھی۔ یاد رہے کہ پلٹن ایک کمپنی سے تقریباً پانچ گنا بڑی ہوتی ہے۔ کرنل مجید کو کرنل صدیق مل گئے۔ وہ بھی اپنی

بٹالین کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ ان کی بٹالین نے دشمن کے ٹینکوں کے پہلے ریلے کا مقابلہ کیا اور ہوشربا جانی نقصان اٹھایا تھا۔ بٹالین بکھر گئی تھی لیکن جوانوں نے انفرادی جنگ لڑ کر حملہ روک لیا تھا۔ اس بٹالین کی ایک پلاٹون کا پہلا تصادم چاروا کے مقام پر ہوا تھا جہاں پوری کی پوری پلاٹون ختم ہو گئی تھی۔

کرنل صدیق نے کرنل مجید کو اگلی پوزیشنیں دکھائیں۔ آر آرگنوں کی موزوں پوزیشنیں بھی بتائیں اور کرنل صدیق چلے گئے کیونکہ ان کی بچی کھچی بٹالین پیچھے جا رہی تھی۔ کرنل مجید اندھیرے میں پوزیشنیں دیکھتے پھر رہے تھے۔ انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ گڈگور والا اہم ٹیلا کہاں ہے اور اس کے خدوخال کیسے ہیں۔ انہیں بلوچ رجمنٹ کا ایک لیفٹیننٹ مل گیا۔ وہ اپنی یونٹ کے ساتھ پیچھے جا رہا تھا۔ کرنل مجید کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ گیا اور انہیں دور سے ٹیلا دکھایا۔ کرنل مجید جیپ میں گڈگور سے گزرے۔ جیپ وہ خود ہی چلا رہے تھے۔ ڈرائیور نے انہیں کہا —— "صاحب ہم شاید بہت آگے نکل آئے ہیں" —— قریب ہی ایک کچے مکان سے بدبو آ رہی تھی۔ دشمن کا ایک تباہ شدہ ٹینک ایک مکان کی دیوار توڑ کر وہیں رکا کھڑا تھا۔ اس میں بھی لاشیں ہوں گی۔ کرنل مجید چوبارہ کے قریب دو سو گز تک چلے گئے۔ کماد اور باجرے وغیرہ کی فصلیں کھڑی تھیں۔ چاندنی بہت مدھم اور پھیکی تھی۔ انہوں نے وہیں رک کر کمپنیوں کی پوزیشنیں سوچ لیں۔

کرنل عزیز کی ٹینک رجمنٹ کے ٹینک آگے آ رہے تھے۔ رات کے وقت ٹینک بیکار ہوتے ہیں۔ کرنل مجید نے میجر اصغر راجہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی کمپنی کو ٹیلے پر مورچہ بند کریں۔ اس کمپنی کے ایک اور افسر صوبیدار ولی محمد تھے۔ کرنل مجید کی نظر میں وہ پیشہ ور سپاہی روشن دماغ اور مضبوط دل گردے والے تھے۔ یہ کمپنی ٹیلے کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ ٹیلا ایک ایسا مورچہ تھا جسے دشمن نے لینے کی پوری کوشش کرنی تھی۔ کرنل مجید نے میجر حمید کی کمپنی کو گڈگور سے بائیں اور ذرا پیچھے بھیج دیا اور میجر اکابر حسین کی کمپنی کو گڈگور سے دائیں اور ذرا پیچھے مورچہ بند کیا۔ بٹالین کی گاڑیوں کو پھلورا کے قریب رکھا اور کمپنیوں سے کہا کہ پیدل اپنے اپنے علاقے میں جائیں اور مورچے کھودیں۔ کرنل مجید نے اپنا ہیڈکوارٹر گڈگور میں رکھا۔ کمپنیاں

اپنے اپنے مورچوں کے علاقے کو روانہ ہوگئیں۔

رات ایک بجے دشمن کے توپ خانے نے گولا باری شروع کر دی۔ یہ فیلڈ اور میڈیم توپ خانے کی گولا باری تھی اور اتنی شدید اور تیز کہ برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ دشمن گولا باری ان جگہوں پر کر رہا تھا جہاں اس شام تک جنرل عبدالعلی کے بریگیڈ کی پلٹنیں مورچہ بند تھیں مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ کرنل مجید کو ڈر یہ تھا کہ ان کی کمپنیاں ابھی کھلے میدان میں ہوں گی اور ابھی مورچے نہیں کھود سکی ہوں گی، لیکن خوش قسمتی سے کمپنیاں مورچوں میں چلی گئی تھیں ورنہ بہت نقصان ہوتا۔ گولا باری بھی ایسی شدید تھی کہ ایسے لگتا تھا جیسے زمین اُکھڑ کر آسمان کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے جواب میں اپنا میڈیم توپ خانہ گولا باری کر رہا تھا ـــــ دشمن کی یہ قیامت خیزی صبح ساڑھے تین بجے ختم ہوئی۔

یہ گیارہ ستمبر کی صبح تھی جو توپ خانوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار کے پیچھے طلوع ہوئی۔ یہ قائداعظمؒ کا یومِ وفات تھا۔ کرنل مجید نے فاتحہ کے لیے بوٹ اتارے، وضو کیا، وردی بدلی، نماز اور فاتحہ پڑھی اور دشمن کی توپوں نے گولے داغنے شروع کر دیئے۔ گولے کہیں اور گر رہے تھے۔

کرنل عزیز کی ٹینک رجمنٹ کا ایک ٹینک آگے آیا۔ تقریباً گیارہ سو گز دور ایک مسجد کے قریب ایک ٹینک کھڑا تھا۔ ہمارے ٹینک نے گولا فائر کیا۔ یہ گیارہویں کیولری کا پہلا گولہ تھا جو ساڑھے چھ بجے صبح فائر ہوا۔ کرنل مجید اپنے اس وقت کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ـــــ "اپنے قریب اپنے ٹینک کی گن کا دھماکہ سن کر میرے جسم میں جان آگئی۔ میرے عقب سے ایسا ہی ایک اور دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وائرلیس سیٹ پر مجھے پیغام سنائی دیا۔ اِدھر سے کہا جا رہا تھا کہ ہم نے دو ٹینک مار دیئے ہیں اور دوسری طرف سے آفرین اور تحسین کے کلمے سنائی دیئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میدانِ جنگ میں ہمارا پہلا دن دشمن کے دو ٹینکوں کی تباہی سے طلوع ہوا ہے مگر میرا ایک عہدیدار چھپتا چھپاتا آگے چلا گیا اور اس نے اطلاع دی کہ دشمن کے یہ دونوں ٹینک پہلے سے تباہ شدہ پڑے تھے۔ میدانِ جنگ میں دراصل ذہنی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ رسی بھی سانپ نظر آتی ہے۔"

صبح طلوع ہو چکی تھی۔ ہمارے دو ٹینکوں نے ایک ایک گولا فائر کر کے میدانِ جنگ کے افتتاح کا اعلان کر دیا تھا۔ کرنل مجید کے ایک کمپنی کمانڈر میجر اصغر راجہ نے انہیں فیلڈ ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ ایک گاؤں پنڈی بھاگو کی طرف سے ٹینکوں کی حرکت نظر آ رہی ہے۔ گرد سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری رجمنٹ ہے۔ ٹینک بائیں کو جا رہے تھے۔ کرنل مجید نے اسے کہا کہ ان کو نظر میں رکھو اور اطلاع دیتے رہو۔ کرنل مجید کو میجر اصغر راجہ کی کمپنی کا جو ٹیلے پر مورچہ بند تھی کوئی فکر نہیں تھا کیونکہ اس کمپنی کا صوبیدار ولی محمد ٹینک شکن فائر کا ماہر تھا۔ تھوڑی دیر بعد میجر اصغر راجہ نے اطلاع دی کہ دشمن کے ٹینکوں کا تقریباً ایک سکواڈرن بائیں طرف حرکت کر رہا ہے اور کچھ ٹینک اس کے ٹیلے کی طرف آ رہے ہیں۔ کرنل مجید نے اسے کہا کہ آر آر (ٹینک شکن گنیں) تیار کر لو ـــــ میجر حمید نے جو گڈگور کے بائیں طرف مورچہ بند تھے اطلاع دی کہ اپنی ٹینک رجمنٹ کے کچھ ٹینک پھلورا سے نکل کر آگے جا رہے ہیں۔ میجر اصغر راجہ نے اطلاع دی کہ دشمن کے ٹینک درختوں کے وسیع جھنڈ میں چلے گئے ہیں، صرف تین آگے آ رہے ہیں۔ یہ ٹینک میجر اصغر راجہ کی آر آر گنوں کی رینج سے دور تھے۔ کرنل مجید نے اسے کہا کہ توپ خانے کی گولا باری کراؤ۔ گولا باری کرائی گئی۔

یہ تینوں ٹینک کہیں پوزیشن میں آ گئے۔ کرنل عزیز کی ٹینک رجمنٹ کے ایک سکواڈرن کے ٹینک آگے جا چکے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ غلطی رجمنٹ کمانڈر کی تھی یا سکواڈرن کمانڈر کی کہ جونہی دشمن کے یہ تین ٹینک ایک ایک کر کے آگے آئے ہمارا سکواڈرن اُن پر چڑھ دوڑا۔ دشمن اسی انتظار میں تھا۔ ہمارے ٹینکوں کے پہلو دشمن کے ان ٹینکوں کے سامنے آ گئے جو جھنڈ میں چھپے ہوئے تھے۔ دشمن نے اسی مقصد کے لیے اپنا ایک ایک ٹینک آگے کیا تھا۔ دشمن کے چھپے ہوئے ٹینکوں نے ہمارے ٹینکوں کو پھندے میں پھانس لیا اور ہمارے کئی ٹینک مارے گئے ـــــ اسی روز ایک اور حادثہ ہوا۔ توپ خانے کے کرنل عبدالرحمٰن، ٹینک رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل عزیز اور ان کے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر منظفر ملک پھلورا میں کہیں اکٹھے کھڑے تھے کہ توپ کا ایک گولا ان کے درمیان آن پھٹا۔ کرنل

عبدالرحمٰن شہید ہو گئے۔ کرنل عزیز کی ایک ٹانگ ٹخنے کے قریب سے کٹ گئی۔ اور میجر مظفر ملک بھی شدید زخمی ہو گئے اور بُری طرح جھلس گئے۔ بیک وقت تین سینئر آفیسر میدان سے اٹھ گئے۔

کرنل مجید کو بعد میں پتہ چلا کہ دشمن نے پھلورا پر شدید گولا باری کی تھی۔ کرنل مجید نے اپنی بٹالین کے تمام اڑھائی ٹن ٹرک پھلورا میں چھوڑ دیئے تھے تاکہ میدانِ جنگ میں دشمن کو اتنا بڑا ٹارگیٹ نہ ملے۔ اپنی کمپنیوں کو انہوں نے پیدل آگے بھیجا تھا۔ ان گاڑیوں اور دیگر سامان کے ساتھ بٹالین کے صوبیدار میجر خدا بخش کو چھوڑا گیا تھا۔ بٹالین تو آگے اپنی پوزیشنوں میں چلی گئی، پیچھے پھلورا پر دشمن نے گولا باری شروع کر دی۔ صوبیدار میجر خدا بخش نے اس حال میں بٹالین کی گاڑیوں کو وہاں سے نکال کر محفوظ مقام پر پہنچایا کہ ہر جگہ گولے پھٹ رہے تھے، ہر طرف گولوں کے ٹکڑے اور پتھر اُڑ رہے تھے اور ایک گاڑی گولے کی براہ راست زد سے جل رہی تھی۔ وقت رات کے اڑھائی بجے کا تھا۔ صوبیدار میجر خدا بخش نے فرض شناسی اور جرأت مندی کا حیران کن مظاہرہ کیا اور اس ایک جلی ہوئی گاڑی کے سوا باقی تمام گاڑیاں اور دیگر سامان گولوں کی بارش میں سے نکال لے گئے۔

انہیں جب اطلاع ملی کہ کرنل عبدالرحمٰن شہید اور کرنل عزیز اور میجر مظفر ملک شدید زخمی ہو گئے ہیں تو صوبیدار میجر خدا بخش پھر قیامت خیز گولا باری میں چلے گئے۔ انہوں نے شہید کی لاش اور دونوں زخمی افسروں کو اٹھایا اور پیچھے لے گئے۔ یہ ان کا دوسرا کارنامہ تھا ورنہ یہ دونوں افسر بھی وہاں پڑے پڑے ختم ہو جاتے۔

دشمن کے ٹینکوں نے ہمارے ٹینکوں کا بُرا حال کر دیا اور کرنل مجید کی اس کمپنی پر حملہ آور ہوئے جو میجر حمید کی زیر کمان گڈگور کے بائیں طرف پوزیشن میں تھی۔ کرنل مجید یہ دیکھ کر کہ گھمسان کا معرکہ ہے فوراً گڈگور سے حمید کی کمپنی کی طرف روانہ ہوئے۔

راستے میں انہیں اپنی اس کمپنی کے کئی جوان اس حالت میں پیچھے آتے نظر آئے کہ ان کی وردیاں خون سے لال تھیں۔ ان میں سے شدید زخمیوں کو اچھے

بھلے جوان سہارا دے کر یا اٹھا کر پیچھے لا رہے تھے۔

ایک عہدیدار سے پوچھا تو اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ ٹینکوں کا بہت بڑا حملہ ہُوا ہے اور اپنی تمام آر آر گنیں تباہ ہو گئی ہیں۔ کمپنی کمانڈر میجر حمید کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ کمپنی مورچوں سے اکھڑ چکی تھی اور بکھر گئی تھی۔ کرنل مجید کے ساتھ اس کمپنی کا نہ ٹیلی فون کا رابطہ رہا تھا نہ وائرلیس کا۔ وائرلیس پر انہیں بہت پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کمپنی کے علاقے میں آدمی بھیجے تو وہاں کمپنی کا سراغ صرف اتنا ملا کہ جگہ جگہ خون اور چند ایک شہیدوں کی لاشیں تھیں اور کمپنی لاپتہ۔

ہُوا یہ تھا کہ دشمن کے ٹینکوں نے ہماری گیارہویں کیولری کے سکواڈرن کو ختم کر کے میجر حمید کی کمپنی پر حملہ کیا۔ اس کمپنی کی آر آر گنیں ابھی پوزیشن میں نہیں تھیں۔ ٹینکوں نے ان گنوں کو تباہ کر دیا پھر ٹینکوں کی مشین گنوں اور بڑی توپوں سے مورچے اکھاڑ دیئے۔

یہ تھا نتیجہ آرمرڈ ڈویژن کے مقابلے میں ایک نامکمل پیادہ پلٹن اور ایک تھکی ہوئی ٹینک رجمنٹ بھیجنے کا —— جہاں پوری بٹالین ہونی چاہیئے تھی وہاں صرف ایک کمپنی تھی۔ اس صورتِ حال میں صرف جذبہ کیا کر سکتا ہے۔

کرنل مجید کے تیسرے کمپنی کمانڈر میجر اکبر حسین تھے جو گڈگور کے دائیں طرف مورچہ بند تھے۔ میجر اکبر حسین جنگِ کشمیر ۱۹۴۸ء کے ستارۂ جرأت ہیں۔ انہیں سبز کوٹ اور پنڈی بھاگو کے درمیان سے دشمن کے ٹینک اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ کرنل مجید نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ اپنی گنیں تیار رکھو اور ضرورت پڑے تو توپ خانے کا فائر لو —— اتنے میں اطلاع ملی کہ کرنل عزیز کی ٹینک رجمنٹ کو "ری گروپنگ" کے لیے پھلورا سے پیچھے بُلا لیا گیا ہے اور اس کی جگہ گائیڈز کیولری کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) امیر گلستان خان جنجوعہ کی زیر کمان آ گئی ہے۔ کرنل مجید کو اطمینان ہُوا کہ دوسری ٹینک رجمنٹ آ گئی ہے لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ اس رجمنٹ کا آتے ہی دشمن سے تصادم ہو گیا۔ دشمن نے ٹینکوں سے بہت بڑا حملہ شروع کر دیا

تھا کرنل عزیز کی رجمنٹ کے متعلق پتہ چلا کہ پسرور پہنچ گئی ہے۔ کرنل گلستان کی رجمنٹ کو دشمن نے معرکے میں الجھا لیا تھا اور اس کے ٹینک تین اطراف سے بڑھے آ رہے تھے۔

میجر اکابر حسین کی کمپنی پر ٹینکوں نے دوطرفی حملہ کر دیا۔ آگے سے اور دائیں سے۔ ایک پیادہ کمپنی جس کے پاس صرف چار یا پانچ ٹینک شکن گنیں تھیں ٹینکوں کے دوطرفی حملے کا مقابلہ کس طرح کر سکتی تھی تاہم کمپنی جذبے کے زور پر ڈٹی رہی اور مقابلہ کرتی رہی۔ اپنے ایک آر آر گنر نے دو ٹینک تباہ کر دیئے اور اور شہید ہو گیا۔ باقی جوان بھی اسی جذبے اور حاضر دماغی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ تقریباً گھیرے کی حالت میں لڑ رہے تھے۔ دشمن پھلورا پر قبضہ کرنا چاہتا تھا میجر اکابر حسین وائرلیس پر کرنل مجید کو رپورٹیں دے رہے تھے۔ بات کرتے کرتے کرنل مجید کو ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی اور ان کا رابطہ میجر اکابر کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ میجر اکابر کا وائرلیس سیٹ تباہ ہو گیا ہے اور کوئی رابطہ نہ رہا۔ فیلڈ ٹیلی فون تھا ہی نہیں۔ کرنل مجید گڈگور میں گئے۔ صرف ٹیلے والی کمپنی میجر اصغر راجہ کے زیر کمان محفوظ تھی اور اس کے ساتھ رابطہ تھا۔ باقی کمپنیوں سے رابطے کٹ چکے تھے۔

دن کا پچھلا پہر تھا۔ نمبر ۱۴ فرنٹیئر فورس اور اپنی پچیسویں ٹینک رجمنٹ جس نے پہلے تین دن دشمن کا مقابلہ کیا اور حملہ روکا تھا، آگے بھیج دی گئیں۔ ٹینکوں کی شدید اور بھیانک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ پھلورا کے گرد و نواح میں خونریز معرکے لڑے گئے۔ کرنل گلستان کی ٹینک رجمنٹ (گائیڈز کیولری) گھیرے میں آ گئی تھی۔ کرنل مجید کی کٹی ہوئی کمپنیاں بھی گھیرے میں لڑ رہی تھیں۔ اس کے باوجود کرنل مجید ہیڈکوارٹر کو حوصلہ افزا رپورٹیں دے رہے تھے۔ وائرلیس کے پیغام دشمن بھی سنتا تھا اس لیے کرنل مجید وائرلیس پر کوئی مایوس کن اور حوصلہ شکن اطلاع نہیں دیتے تھے۔ توپخانے کی گولہ باری بے تحاشا تھی۔ گولے کرنل مجید کے ہیڈکوارٹر کے ارد گرد بھی گر رہے تھے۔ سبز پیر، سبز کوٹ اور پنڈی بھاگو کی طرف سے دشمن کا انفنٹری ڈویژن آتا نظر آیا۔ اس وقت تک اس کے صرف ٹینک لڑ رہے تھے۔

اب انفنٹری بھی آ گئی۔ یہ آگ کا طوفان تھا۔ ہماری جو مختصر سی نفری تھی وہ گھیرے میں آ گئی تھی۔ دشمن پھلورا سے بھی آگے نکل گیا۔

سورج غروب ہو گیا۔ ٹینکوں کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ کرنل مجید کی کمپنیوں کی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ پیچھے نکل آنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ میجر حمید کی کمپنی پہلے ہی میدان سے اٹھ گئی تھی۔ میجر اکابر حسین کی کمپنی نے گھیرے میں ٹینکوں کا مقابلہ کیا مگر شام تک ان کے کئی جوان شہید اور بے شمار زخمی ہو چکے تھے۔ ان کے لیے اب یہی صورت رہ گئی تھی کہ اگلے روز دشمن کے ٹینک ان کے اوپر سے گزر جاتے۔ شام کے وقت میجر اکابر کرنل مجید کے پاس گئے اور انہیں اپنی کمپنی کی کیفیت بتائی۔ گڈگور کے ٹیلے پر میجر اصغر راجہ کی کمپنی بدستور مورچہ بند تھی۔ وہ بھی دن بھر لڑتی رہی تھی۔ کرنل مجید نے اس کمپنی کو پیچھے بلا لیا۔ دشمن کی انفنٹری ہر طرف پھیل گئی تھی۔ پھلورا کے متعلق واضح نہیں تھا کہ وہاں دشمن کا قبضہ ہے یا اپنا۔ گرد و پیش میں ہر مقام پر اور ہر ایک راستے پر یہ خطرہ تھا کہ وہاں دشمن پھیل گیا ہے۔ جوان پیدل نکل سکتے تھے۔ آر آر جیپوں کو نکالنا اس وجہ سے خطرناک تھا کہ گاڑیوں کی آواز دشمن کو خبردار کر دے گی۔ اس کے باوجود کرنل مجید نے حکم دیا کہ ایک بھی گاڑی پیچھے نہیں چھوڑی جائے گی۔ انہوں نے آر آر گنوں والی جیپیں سڑک پر رکھیں اور جوانوں کو دائیں بائیں چلنے کی ہدایت کی۔ دوسری گاڑیاں توپ خانے کا ایک میجر اپنی نگرانی میں لے گیا۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ جب پھلورا پہنچ جائے تو کرنل مجید کو اطلاع دے۔

کرنل مجید میدانِ جنگ کو خاموشی سے چھوڑ کر نہیں آنا چاہتے تھے۔ وہ اطلاع کا انتظار کرتے رہے۔ خاصا وقت گزر گیا مگر کوئی اطلاع نہ آئی۔ انہیں فکر ہوا کہ گاڑیاں دشمن کے ہاتھ نہ چڑھ گئی ہوں۔ وہ جیپ میں پھلورا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دونوں طرف کے توپ خانے گولہ باری کر رہے تھے۔ کرنل مجید کے ساتھ ان کا ڈرائیور، وائرلیس آپریٹر اور انٹیلی جنس حوالدار تھا۔ وہ پھلورا سے تقریباً دو سو گز پیچھے ہی رک گئے۔ انہیں دو فوجی گزرتے نظر آئے۔ چاندنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کرنل مجید نے ان دونوں سے پوچھا کہ وہ کونسی رجمنٹ کے ہیں لیکن وہ دونوں آگے نکل

گئے۔ پھلورا میں ایک مشین گن فائر ہوتی۔ کرنل مجید کو فکر ہُوا کہ یہ اپنے ٹروپس غلطی میں ہمارے ہی اُن جوانوں پر فائر کر رہے ہوں گے جو پھلورا سے گزر رہے ہیں۔ کرنل مجید نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے وائرلیس آپریٹر نائک سناب گل نے کہا کہ وہ آگے جائے گا اور صورتِ حال کی آ کر رپورٹ دے گا۔

وہ چلا گیا۔ خاصی دیر گزر گئی۔ واپس نہ آیا۔ انٹیلی جنس حوالدار نے کہا کہ وہ اسے جا کر دیکھتا ہے لیکن کرنل مجید نے اسے نہ جانے دیا۔ وہ جیپ میں بیٹھے۔ ڈرائیور اور انٹیلی جنس حوالدار کو ساتھ بٹھایا اور پھلورا کے چوراہے پر پہنچ گئے۔ جیپ روک کر اترے۔ انہیں نائک سناب گل نظر نہیں آ رہا تھا۔

کرنل مجید ٹہلتے ٹہلتے آگے چلے گئے۔ ایک درخت کے نیچے انہیں دو سائے کھڑے نظر آئے۔ کرنل مجید نے ان کے پاس رُک کر پوچھا ——— "تم کون سی رجمنٹ کے ہو؟" ——— انہیں جواب ملا "۵ جاٹ رجمنٹ" ——— کرنل مجید دو چار سیکنڈ کے لئے بھول ہی گئے کہ وہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے اسی جاٹ رجمنٹ میں تھے۔ اب یہ رجمنٹ انڈین آرمی میں تھی۔ کرنل مجید نے اس رجمنٹ کا نمبر سُنا تو اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا ——— "یہ تو میری پرانی رجمنٹ ہے" ——— اور اس کے ساتھ ہی وہ چونکے اور سرتاپا لرز گئے۔ ان کا ذہن بیدار ہو گیا۔ یہ تو دشمن کے آدمی ہیں۔

کرنل مجید نہایت آرام اور اطمینان سے وہاں سے چلے۔ ان کا خیال تھا کہ ان دو بھارتی فوجیوں نے انہیں پہچانا نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بھارتیوں کو شک ضرور ہو گیا تھا کیونکہ کرنل مجید جب اپنی جیپ کے پاس پہنچے تو پیچھے سے ان پر سٹین گن فائر ہوئی۔ سٹین گن کا فائر صحیح نہیں ہُوا کرتا۔ کرنل مجید پلک جھپکتے جیپ کے ایک طرف زمین پر لیٹ گئے۔ ان کا انٹیلی جنس حوالدار اور ڈرائیور دوڑ کر سڑک کے بائیں طرف اُتر گئے۔ کرنل مجید کو صرف اپنی جان بچانے کا فکر نہیں تھا۔ وہ پیچھے آتی ہوئی اپنی کمپنی کو خبردار کرنا چاہتے تھے کہ پھلورا میں سے نہ گزریں۔ وائرلیس سیٹ جیپ میں تھا مگر اس کا مائیکروفون دوسری طرف تھا۔ وہ دوسری طرف زمین پر تھے۔ اُن پر سٹین گن کے برسٹ فائر ہو رہے

تھے اور اب خطرہ یہ بھی سر پر آ گیا تھا کہ پھلورا میں جو دشمن ہے وہ بیدار ہو گیا ہو گا اور چند لمحوں میں انہیں گھیر کر پکڑ لے گا۔ پھر بھی وہ پیچھے اطلاع دیئے بغیر نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ گاڑیاں اور آر آر گنیں دشمن کے ہاتھ چڑھ گئیں تو یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا اور انہیں یہ خطرہ بھی محسوس ہونے لگا کہ گاڑیاں کہیں دشمن کے ہاتھ چڑھ ہی تو نہیں گئیں؟ ——— کرنل مجید پر سٹین گنوں کے برسٹ فائر ہو رہے تھے مگر وہ بھاگنے کی بجائے وائرلیس سیٹ کے مائیکروفون تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اُٹھ نہیں سکتے تھے ورنہ اُڑ جاتے۔

اتنے میں دشمن ہر طرف سے بیدار ہو گیا اور جیپ پر چاروں طرف سے فائر آنے لگا۔ یہ گولیوں کی بارش تھی۔ مائیکروفون تک پہنچنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ کرنل مجید رینگ کر سڑک سے اُتر گئے اور وہاں فائر رکنے کا انتظار کیا مگر فائر ختم نہ ہُوا۔ بلکہ فائر کے ساتھ انہیں بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بھارتی کرنل مجید کو پکڑنے کے لیے دوڑتے پھر رہے تھے۔ چاندنی ذرا صاف ہو گئی۔ کرنل مجید دوڑ پڑے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے آدمی آگے نکل گئے تھے۔ دشمن نے کرنل مجید کو دیکھ لیا اور دو آدمی ان کی طرف دوڑے۔ قریب ہی اونچی فصل تھی۔ کرنل مجید اس میں چلے گئے اور فصل کے اندر ہی اندر بھاگتے رہے۔ فصل سے نکل کر سوچنے لگے کہ کدھر کا رُخ کیا جائے۔ اچانک بائیں طرف دو آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے سڑک کوئی ایک سو گز دور تھی۔ کرنل مجید نے سو گز دوڑ کی سٹارٹ لی۔ انہیں ہر لمحہ توقع تھی کہ پیچھے سے گولی یا گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور ان کے جسم سے پار ہو جائے گی۔

گولی تو کوئی نہ آئی۔ کرنل مجید ایک کھڈ میں گرے اور غشی آ گئی۔ کئی راتوں سے وہ سو نہیں سکے تھے۔ مسلسل بھاگ دوڑ لگی رہی تھی اور ذمہ داری کا بوجھ اعصاب پر تھا اس سے اعصابی نظام بُری طرح مجروح ہو گیا تھا۔ کمپنیوں اور گاڑیوں کے بکھر جانے کی تشویش الگ تھی۔ جسمانی مشقت اور ذہنی پریشانی نے انہیں گرا دیا اور بے ہوش ہو گئے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے۔ ہوش میں آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا ایک ہاتھ ایک آدمی نے

پکڑ رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ کسی دوسرے آدمی نے - انہیں سب سے پہلے اپنا ریوالور یاد آیا جو اُن کے ہاتھ میں تھا - اب ہاتھ میں نہیں تھا لیکن ریوالور دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود ان کے جسم سے الگ نہیں ہُوا تھا - اس کی رسّی ان کی بیلٹ کے ساتھ بندھی ہوئی تھی - یہ دونوں آدمی کرنل مجید کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے - ایک نے پوچھا ——— "کدھر جاتا ہے ؟ کون ہے تم ؟"

کرنل مجید ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئے ورنہ سنبھل کر جواب دیتے - ان کے منہ سے نکل گیا ——— "بٹالین کمانڈر ہوں"۔

وہ دونوں بھارتی فوجی تھے - ایک نے کہا ——— "ریوالور اتارو" ———

کرنل مجید ایک ہاتھ سے بیلٹ سے رسّی کھولنے لگے لیکن گانٹھ ایک ہاتھ سے کھل نہیں رہی تھی - حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنی جلدی گانٹھ کھولنا نہیں چاہتے تھے - وہ گانٹھ کھولتے کھولتے ان دونوں بھارتیوں کا جائزہ لے رہے تھے - جو بھارتی اُن سے ریوالور کی رسّی کھلوا رہا تھا ، اس کی سٹین گن سلنگ سے اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی دوسرے نے سٹین گن اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی - کرنل مجید نے ترکیب سوچ لی - انہوں نے ریوالور کی رسّی کی گانٹھ کھول کر اسی بھارتی کے ہاتھ میں دے دی جس کی سٹین گن کندھے سے لٹک رہی تھی - انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور سٹین گن کندھے پر ہے - وہ گن سیدھی کرنے کے لیے کچھ وقت لگائے گا - خطرناک دوسرا تھا جس کی گن اس کے ہاتھوں میں تھی -

کرنل مجید نے ریوالور کی رسّی کھولی اور اس کے ساتھ ہی پوری طاقت سے ٹھڈ دوسرے کی سٹین گن کو مارا لیکن ٹھڈ سٹین گن کو لگنے کی بجائے اس بھارتی کی ناف کے نیچے لگا - وہ درد کی شدّت سے دُوہرا ہو گیا - کرنل مجید کا دوسرا ہاتھ بھی آزاد ہو گیا - وہ بجلی کی تیزی سے دوڑے -

دونوں بھارتی شاید سنبھل نہیں سکے تھے - آگے فصل آ گئے -

کرنل مجید فصل میں چلے گئے - آگے کچھ کھیت خالی تھے - دُور سے مشین گنیں فائر ہو رہی تھیں - ٹریسر گولیوں کی چمکتی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں - آگے کماد

کا کھیت آ گیا - کرنل مجید اس میں گھس گئے اور لیٹ گئے - ان کے اوپر سے گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں - ان کی جسمانی حالت یہ تھی کہ دم پھُول گیا تھا - ٹانگیں لرزنے لگی تھیں اور جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی -

کماد کے کھیت میں لیٹ کر انہوں نے اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھالا - انہیں تقریباً پانچ سو گز دُور "جے ہند" اور "اللہ اکبر" کے نعرے سنائی دینے لگے ہر قسم کے ہتھیاروں کی فائرنگ ہو رہی تھی - صاف پتہ چلتا تھا کہ دست بدست معرکہ لڑا جا رہا ہے ——— بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ میجر اصغر راجہ کی کمپنی تھی جو پھلورا سے گزری تو دشمن نے اسے گھیر لیا - بٹالین کے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر منصور اور بٹالین ہیڈ کوارٹر کے افسر بھی اس کے ساتھ تھے کرنل مجید کو اسی کمپنی کے متعلق پریشانی تھی - اس لیے وہ سٹین گنوں کی بوچھاڑوں میں بھی اپنے وائرلیس سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ کمپنی کو خبردار کر دیں کہ پھلورا سے دُور رہے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے - اس سے پہلے توپ خانے کا جو میجر بٹالین کی گاڑیاں لایا تھا ، وہ گاڑیوں کو پھلورا میں سے یعنی دشمن کے عین درمیان سے گزار کر لے گیا تھا - دشمن کو اس وقت پتہ چلا تھا کہ گاڑیوں کا یہ قافلہ پاک فوج کا تھا جب گاڑیاں دُور نکل گئی تھیں - چنانچہ دشمن ہوشیار ہو گیا تھا -

پیچھے میجر اصغر راجہ کی کمپنی اور بٹالین ہیڈ کوارٹر آ رہا تھا - انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ پھلورا میں دشمن ہے - لہٰذا افسروں نے کمپنی کو ہوشیار کر دیا اور دلیرانہ فیصلہ کیا کہ پھلورا میں سے گزریں گے - جونہی یہ نفری پھلورا میں سے گزرنے لگی ، دشمن گھات سے اُٹھا اور ہلّہ بول دیا - جوان تیار تھے - کسی نے بھاگنے کی نہ سوچی - جوان دست بدست معرکہ لڑے - POINT BLANK RANGE پر ایک دوسرے پر فائرنگ کی گئی - یہ تھی صحیح معنوں میں جذبے کی جنگ جس میں ہمارے افسروں نے دشمن کی طاقت اور پوزیشن کی پروا نہ کرتے ہوئے لڑ کر راستہ لینے کا عزم کیا - دشمن نے اس توقع پر کہ یہ سب جنگی قیدی ہیں ، انہیں روکنے ، گھیرنے اور ہتھیار ڈلوانے کی کوشش کی لیکن افسروں اور جوانوں نے "اللہ اکبر" کے نعروں سے بے جگری اور غیض و غضب سے لڑ کر راستہ بنا لیا -

اس معرکے میں انفرادی شجاعت کے بہت مظاہرے ہوئے۔
لیفٹیننٹ مہدی نے ایک ہندو لیفٹیننٹ کو پکڑ لیا۔ اس ہندو نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیفٹیننٹ مہدی نے اسے گولی مار دی۔ دشمن نے جب دیکھا کہ اس کی پیادہ نفری پاکستانیوں کو قابو نہیں کر سکتی تو ایک ٹینک لے آیا جس کی مشین گن فائر ہونے لگی۔ ہماری ایک جیپ پر آر آر گن نصب تھی۔ اس کے گنر نے جیپ ٹینک کے آگے کر دی اور گولا فائر کیا۔ چونکہ روشنی راؤنڈ بھی فائر ہو رہے تھے اس لیے ٹینک والوں کو جیپ نظر آ گئی۔ جیپ کی آر آر سے گولا نکلا اُدھر ٹینک کی مشین گن نے فائر کیا۔ ٹینک تباہ ہو گیا اور اِدھر آر آر کا توپچی بھی شہید ہو گیا۔

بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ کرنل مجید کا وائرلیس آپریٹر نائک سناب گل جو پھلورا میں صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے چلا گیا تھا، دشمن کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ جب میجر اصغر راجہ کی کمپنی پر دشمن نے حملہ کیا اور دست بدست لڑائی ہوئی تو نائک سناب گل جو دشمن کا قیدی تھا دشمن کے ہاتھ سے نہایت دلیری سے نکل آیا اور لڑائی میں شریک ہو گیا۔ وہ کمپنی کے ساتھ صحیح وسلامت پیچھے آ گیا تھا۔

یہ خبریں کرنل مجید کو بعد میں ملیں۔ جب کمپنی لڑ رہی تھی وہ کماد کے کھیت میں ذرا ستا رہے تھے تاکہ نیم جان جسم وہاں سے نکلنے کے قابل ہو جائے۔ وہ "جے ہند" اور "اللہ اکبر" کے نعرے سنتے رہے اور جان نہ سکے کہ یہ کون لڑ رہا ہے۔ نصف گھنٹہ بعد یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ (بعد کی اطلاع کے مطابق کمپنی نکل آئی تھی)۔
کرنل مجید پھلورا چونڈہ روڈ پر جانا چاہتے تھے جو اُن سے تین چار سو گز دُور تھی۔ جب معرکے کا ہنگامہ ختم ہو گیا تو کرنل مجید اٹھنے لگے۔ ان کا ہاتھ بائیں گھٹنے پر پڑا تو انہیں وہاں درد محسوس ہوا اور ہاتھ کو کوئی گرم چیز بھی لگی۔ انہوں نے ہاتھ پھیرا تو وہاں سے پتلون پھٹی ہوئی تھی۔ گھٹنے پر گہرا زخم تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ ان کے پاس فیلڈ پٹی نہیں تھی۔ انہوں نے خون روکنے کے لیے پتلون پر ہاتھ رکھ کر زخم پر دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد پتلون زخم پر چپک گئی۔ جب اٹھے تو زخم پر چپکی ہوئی پتلون نے زخم کو تکلیف دینی شروع کر دی۔ چلنے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ زخم

سے پتلون الگ کریں تو خون بہنے کا خطرہ اور چپکی رہنے دیں تو چلنے سے درد ہوتا تھا۔ انہیں کچھ یاد نہیں کہ یہ زخم کہاں آیا تھا۔ زخم دیکھ کر انہیں معلوم ہوا کہ جسمانی نقاہت تیزی سے بڑھ کیوں رہی ہے۔ دراصل خون بہت نکل گیا تھا۔ جسمانی مشقت اور ذہنی اذیت کے اثرات الگ تھے۔ جسم اب تیز چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ وہاں لیٹے تو نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اٹھنے لگے تو دشمن نے مارٹر فائر شروع کر دیا۔ دشمن اب تمام علاقے میں بے پناہ اور اندھا دھند فائرنگ اس خیال سے کر رہا تھا کہ میجر اصغر راجہ کی کمپنی کے جوان اگر فصلوں میں چھپ گئے ہیں یا کہیں جا رہے ہیں تو زد میں آ جائیں۔

مارٹر گنوں کے گولے کماد کے کھیت کے باہر گرتے رہے۔ پھر گولے کھیت کے اندر گرنے لگے۔ کئی گولے کرنل مجید کے قریب پھٹے لیکن ان کے اُڑتے ٹکڑوں اور دھماکے کی تباہ کاری کو کماد کے پودوں نے روک لیا۔ ایک گولا ان کے بالکل قریب گرا۔

کرنل مجید نے اس کے گرنے کی آواز سُنی اور دو سیکنڈ تو وہ سُن ہو کے رہ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس گولے اور ان کے درمیان کماد کے بالکل ناکافی پودے ہیں مگر گولا پھٹا ہی نہیں۔ ڈیڈ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے مشین گنوں کا فائر اس طرح شروع کر دیا کہ مشین گنوں کی نالیاں دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں گھومتی اور اوپر نیچے بھی ہوتی تھیں۔ اسے انگریزی میں COMBING FIRE کہتے ہیں۔ یعنی بالوں میں جس طرح کنگھی پھرتی ہے۔ ایسے فائر سے کھیت میں کوئی جاندار بچ نہیں سکتا۔

کرنل مجید کماد میں لیٹ گئے۔ کھیت کے اندر گولے بھی پھٹ رہے تھے اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں بھی گزر رہی تھیں۔ زندہ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کرنل مجید کو موت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نظر آ گئی۔ انہوں نے دل ہی دل میں اُن لوگوں سے معافی مانگی جن کے ساتھ انہوں نے کبھی کوئی زیادتی کی تھی یا کسی کا دل دکھایا تھا۔ گو انہیں کوئی ایسا انسان یاد نہ آیا۔ پھر انہیں ۱۹۴۷ء

کے وہ مہاجرین یاد آئے جو ہجرت کے دوران شہید ہوئے تھے۔ ان کا ذہن انہی پر اٹک گیا اور وہ سوچنے لگے کریں تو فوجی ہوں۔ پیاسا مر جانا، کسی ٹینک تلے کچلا جانا اور بڑی اذیت ناک موت ہر فوجی کی قسمت میں لکھی ہے جس کے لیے ہر فوجی ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔ اُن مہاجر خواتین اور بچوں پر کیا گزری ہوگی جو میری طرح فصلوں اور کھڈ نالوں میں چھپتے چھپاتے پاکستان کی راہ پر چلے آ رہے تھے اور شہید ہو گئے تھے۔ وہ پردہ نشین عورتیں، وہ دیہات کے سیدھے سادے لوگ اور ان کے بچے جانے کس کس اذیت سے شہید ہوتے ہوں گے۔

کرنل مجید کا ذہن ماضی میں چلا گیا۔ اپنے متعلق انہوں نے فیصلہ کیا کہ رات کماد میں گزاریں گے اور صبح گرد و پیش کو دیکھ کر نکلیں گے۔ مشین گنوں کا فائر ختم ہو گیا۔ کرنل مجید لیٹے رہے۔ ایک لمحہ بھی نہ سو سکے اور صبح طلوع ہوئی۔ وہ اٹھے مگر مشین گنوں کا فائر پھر شروع ہو گیا۔ وہ فوراً لیٹ گئے۔ گولیاں اُن کے اوپر سے، بہت قریب سے گزرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد فائر ختم ہو گیا اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ بھارتی تھے۔ رات کے پاکستانیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ کرنل مجید کے بالکل قریب آ گئے۔ کرنل مجید کے پاس ریوالور بھی نہیں تھا۔ فولادی خود (سٹیل ہیلمیٹ) بھی پھلورا جیب میں رہ گیا تھا ـــــ یہ آوازیں دُور چلی گئیں۔

کرنل مجید کا ذہن صاف ہُوا تو انہیں رات کی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ رات بھر وہ بیلوں کے گلے سے بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنتے رہے تھے۔ ایک آدمی کی آواز بھی آتی رہی جس سے یوں پتہ چلتا تھا کہ یہ آدمی ہل چلا رہا ہے۔ کرنل مجید سوچنے لگے، کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی دیہاتی اُس میدان میں ہل چلاتا ہوگا جہاں توپ خانے گولا باری کر رہے تھے اور جہاں ٹینک لڑ رہے تھے؟ شاید کوئی آدمی بھاگے ہوئے مویشیوں کو پکڑ رہا ہوگا۔

رات کی ایک اور آواز پُراسرار اور فکرانگیز تھی۔ رات بھر ایک عورت کی سخت تیکھی اور غصیلی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ قریب ہی کسی چھوٹے سے گاؤں میں معلوم ہوتی تھی۔ جنگ کی زد میں آئے ہوئے گاؤں خالی ہو چکے تھے۔ یہ

عورت وہاں کیوں رہ گئی تھی؟ وہ رات بھر کسی کو گالیاں دیتی اور لڑتی رہی۔ کسی دوسرے کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ کس سے لڑ رہی تھی؟ شاید کوئی پاگل ہو۔ اگر وہ پہلے ہی پاگل نہیں تھی تو جنگ نے اور بھارت کے درندہ صفت فوجیوں نے اسے پاگل کر دیا ہوگا۔ وہ ماں ہو سکتی تھی جس کے بچے توپ کے گولے کی نذر ہو گئے ہوں گے۔ وہ کسی ایسی جوان بیٹی کی ماں ہو سکتی تھی جو ہندوؤں کی بربریت اور وحشی پن کا شکار ہو گئی ہوگی۔

اور یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ خود جوان ہو اور بھارت کے بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رات کو وہ بھارتیوں سے ہی لڑ رہی ہو اور پاگل پن میں کوٹھے پر کھڑی انہیں گالیاں دے رہی ہو۔

جنگ میں حیران کُن واقعات رونما ہوتے ہیں۔ معجزے بھی ہوتے ہیں مگر جنگ کی لپیٹ میں جب نہتے شہری اور دیہاتی آجاتے ہیں تو بڑے ہی شرمناک اور بڑے ہی دردانگیز حادثے ہوتے ہیں ـــــ عورتیں دشمن کی ہوس کا نشانہ بن کر مر بھی جاتی ہیں، پاگل بھی ہو جاتی ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ ان کی روحیں وہیں بھٹکتی رہتی ہوں ـــــ یہ عورت بھی جس کی آوازیں کرنل مجید سنتے رہے تھے کسی مظلوم شہید عورت کی بھٹکتی ہوئی روح ہو سکتی تھی۔

کرنل مجید کھیت سے نکلنے سے پہلے باہر کی آوازوں سے یہ اندازہ کرنے لگے کہ اپنے مورچے کدھر اور کتنی دُور ہوں گے۔ دشمن کے ایئر او پی کا چھوٹا طیارہ آ گیا جو تھوڑی دیر کھیت کے اُوپر اُوپر اُڑا اور چلا گیا۔ توپ خانوں کی گولا باری ہوتی رہی۔ ٹینکوں کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن پھلورا پر قبضہ مستحکم کر چکا ہے اور اب کسی سمت سے ٹینکوں کی پیشقدمی کر رہا ہے۔ دشمن کا ایک ٹینک کماد کے اسی کھیت کے کونے پر آن رُکا جہاں کرنل مجید چھپے ہوئے تھے۔ انہیں ٹینک کے ٹرٹ کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی بھارتی ٹینک کے اوپر کھڑا ہوتا تو کرنل مجید کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ ٹینک اُن سے صرف ساٹھ گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ کرنل مجید نے گھڑی دیکھی۔ دن کے پونے گیارہ بجے تھے۔

ٹینک والے آپس میں باتیں کرنے لگے جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی رجمنٹ یا سکواڈرن کو پیش قدمی کا حکم ملا ہے۔ اب کرنل مجید کو یہ خطرہ محسوس ہُوا کہ ٹینک کھیتوں میں پیش قدمی کریں گے۔ میدانِ جنگ میں ٹینک سڑکوں یا راستوں پر پیش قدمی نہیں کیا کرتے۔ کھیتوں اور فصلوں کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ کرنل مجید کو اب یہ نظر آنے لگا کہ ٹینک کماد کے کھیت میں سے گزرتے انہیں کچل جائیں گے۔ اگر وہ بھاگنا چاہیں تو پکڑے جائیں گے۔ اب وہ باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ باہر ایک ٹینک یا نہ جانے اِدھر اُدھر کتنے ٹینک اور پیادہ فوجی موجود ہوں گے ___ انہیں پیاس اور بھوک کی شدت کا احساس ہُوا۔ وہ کئی راتوں سے سوئے نہیں تھے۔ کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کماد سے بڑھ کر اور کون سی غذا اچھی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک گنا توڑنے لگے تو رک گئے۔ گنے کے ٹوٹنے اور ہلنے کی آواز بھارتیوں کو بیدار کر سکتی تھی۔ کرنل مجید کو بہت افسوس ہُوا کہ رات کو انہوں نے گنے نہ چوسے۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر شل تھے کہ پیٹ کی تو سوچ ہی نہ سکے۔ اب کماد کے کھیت میں ہوتے ہُوئے بھی وہ گنا نہیں چوس سکتے تھے۔

انہوں نے جذبات سے نکل کر حقیقت پسندی سے اپنے متعلق سوچا تو ان کے سامنے دو راستے آئے ___ بغیر لڑے مرنا یا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر کے اگلی جنگ کے لیے زندہ رہنا ___ انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہُوئے۔ ان کی جیب میں سفید رومال تھا۔ انہوں نے رومال نکالنے کے لیئے ہاتھ جیب میں ڈالا تاکہ رومال نکال کر اوپر کریں اور باہر جا کر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں۔ اچانک بجلی کی چمک کی طرح خیال آیا ___ "میں کرنل ہوں۔ بٹالین کمانڈر ہوں۔ دشمن تشہیر کرے گا کہ اس نے پاک فوج کے ایک کرنل کو پکڑ لیا ہے۔ میری اپنی قوم بھی سنے گی۔ قوم کو شرمسار ہونا پڑے گا۔۔۔ نہیں، میں قید قبول نہیں کروں گا" ___ ان کا ہاتھ رومال والی جیب میں ہی رہا۔

یہ خیال آتے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر انہیں گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ رہا۔ یہ نیند کا غلبہ تھا۔ ان کی آنکھ کھلی تو شام کے چار بج چکے تھے۔ کرنل مجید حیران ہُوئے کہ وہ پانچ گھنٹے سوئے رہے ہیں۔ ان کا دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا۔ دیکھا کہ ٹینک وہیں کھڑا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ سونے سے پہلے اس ٹینک سے ایک آواز یہ آئی تھی ___ "او دیکھ مُوہرے ٹینک کھڑا" ___ یہ کوئی دوآبے کا سکھ تھا جس نے پنجابی میں کہا تھا ___ "وہ دیکھ۔ سامنے ٹینک کھڑا ہے" ___ کرنل مجید نے اس ٹینک کے سامنے کے مطابق سمت کا اندازہ کیا۔ وہ کسی پاکستانی ٹینک کے متعلق بات کر رہا ہو گا۔ انہوں نے سوچا کہ خدا نے انہیں بچا لیا ہے اور اب امید ہے کہ وہ نکل جائیں گے۔ وہ نکلنے کی ترکیبیں سوچتے رہے اور سورج غروب ہونے لگا۔

کرنل مجید اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھٹکا لگا تو زخم سے پتلون اکھڑ گئی اور خون بہ نکلا لیکن اب خون زیادہ نہیں تھا۔ وہ کھیت سے نہایت آہستہ آہستہ باہر نکلے تاکہ کماد کا کوئی پودا اوپر سے ہلے نہیں۔ ٹینک کھیت کے ایک کونے پر کھڑا تھا، وہ کھیت کے دوسرے کونے سے باہر نکلے۔ نکلنے سے پہلے اِدھر اُدھر جھانکا صرف یہی ایک ٹینک کھڑا تھا۔ کرنل مجید باہر نکل گئے۔ آگے مینڈھ تھی۔ ذرا پرے درختوں کے دو جھُنڈ تھے۔ وہ ذرا تیز چلے تو نقاہت سے گر پڑے۔ انہیں اپنی بے بسی پر غصہ آ گیا۔ ان کے منہ سے نکلا ___ "اس سے بہتر تھا کہ مر ہی جاتے" ___ لیکن غصے پر انہوں نے قابو پا لیا اور اپنے آپ کو یقین دلایا کہ مرتے دم تک انسان میں ہمت اور جرأت موجود رہتی ہے خواہ جسمانی لحاظ سے وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو جائے ___ وہ ہمت کر کے اٹھے اور مینڈھ کی اوٹ میں رینگنے لگے اتنے میں شام گہری ہونے لگی۔ انہوں نے درختوں کے دو جھُنڈ دیکھے تھے۔ وہ دائیں والے جھُنڈ کی طرف چلے گئے

وہاں رہٹ تھا۔ ایک چارپائی پڑی تھی۔ کسی نے وہاں تھوڑا ہی وقت پہلے آگ بھی جلائی تھی جو بجھی ہُوئی تھی۔ وہاں انہوں نے زمین پر ٹینکوں کے پٹوں کے نشان دیکھے اور انہیں خیال آیا کہ اپنے ٹینک وہاں تک ضرور گئے ہیں۔ انہوں

نے رہٹ کے بھرے ہوئے ڈولوں سے پانی پیا۔ قریب کماد کا کھیت تھا۔
گنا توڑ کر چوسا۔ جسم میں زندگی عود کرنے لگی۔ گھٹنے کا زخم انہیں تیز چلنے نہیں
دیتا تھا۔ انہوں نے اپنی پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کی اور سوچا کہ انہیں کس
سمت جانا چاہیئے۔ وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ اچانک مارٹرگنوں کی گولا باری
شروع ہو گئی۔ پہلے تو گولے کسی اور جگہ گرتے رہے۔ پھر کوئیں پر گولے پھٹنے
لگے۔ کرنل مجید دوڑ کر پانی کی نالی میں لیٹ گئے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ دشمن
یہاں کیوں مارٹر فائر کر رہا ہے۔ دُور دُور محاذ زندہ تھا۔ افق پر توپوں کی چمک
بجلی کی طرح نظر آتی تھی۔ توپوں سے گولے نکلنے اور آگے جا کر پھٹنے کے
دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ رات ہو جانے کی وجہ سے ٹینک خاموش
ہو گئے تھے۔

مارٹر فائر رک گیا۔ کرنل مجید نالی سے اُٹھے۔ انہیں قریب ایک کوٹھڑی
نظر آئی قریب گئے تو اندر سے سخت بدبُو آتی۔ اندر لاشیں ہوں گی۔ وہ کوئیں پر گئے اور چارپائی پر لیٹ
گئے۔ لیٹے لیٹے بُوٹ اُتارنے لگے۔ انہیں دو آدمیوں کی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اسی طرف آ رہے
تھے۔ کرنل مجید نے ابھی بُوٹ اتارے نہیں تھے۔ قریب جو کماد کا کھیت تھا اس
میں جا چھپے۔ انہوں نے کماد میں سے جھانک کر دیکھا۔ پھیکی سی چاندنی تھی۔ وہ
بھارتی تھے۔ وہ چارپائی پر آ بیٹھے۔ اگر کرنل مجید دو منٹ اور چارپائی پر لیٹے رہتے
تو پکڑے جاتے۔ بھارتیوں کے پاس وائرلیس سیٹ تھا۔ انہوں نے سیٹ
پر کسی سے بات کی اور چلے گئے۔ وہ دُور نکل گئے تو کرنل مجید کھیت سے نکل
کر وزیروالی کی طرف چل پڑے۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ چلتے ہی جائیں گے۔
کہیں رکیں گے نہیں خواہ کہیں رینگنا ہی پڑے۔

وہ گرد و پیش کی آہٹوں پر کان لگائے چلتے گئے۔ آگے ایک ٹیوب ویل
آ گیا۔ ارد گرد سبز گھاس تھی اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ ایسی پیاری گھاس ایسی خنک
ہوا اور یہ تھکن، لیٹ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ شاید کرنل مجید وہاں لیٹ ہی جاتے
لیکن دشمن کے میڈیم توپ خانے کی گولا باری شروع ہو گئی۔ وہ ٹیوب ویل سے پانی
پی کر آگے چلنے لگے تو انہیں آٹے کی بُو آئی۔ ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ اندر سے

بند تھا۔ وہ دوسری طرف گئے۔ اس طرف والے دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ یہ
آٹا پیسنے والی مشین تھی۔ مالک غائب تھے۔ آگے گئے تو امرودوں کا باغیچہ آ گیا۔
ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر امرود گرائے۔ پکے ہوئے تھے اور نہایت اچھے۔ کچھ کھائے اور کچھ
جیب میں ڈالے اور ذرا آگے گئے تو ایک رہٹ نظر آیا۔ وہاں نہایت اچھا پلنگ
رکھا تھا۔ ایسی خوبصورت جگہ کے رہنے والے جانے کس حال میں یہاں سے بھاگے
تھے۔

کرنل مجید پلنگ پر لیٹ گئے۔ گھٹنے کا زخم اور جسمانی تھکان نے انہیں چلتی
پھرتی لاش بنا دیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ جنگ ہے جس کی تباہ کاریوں کو فوج
اپنے اوپر لے لیتی ہے اور صرف اس لیے لے لیتی ہے کہ دیہات کے یہ معصوم
اور بے گناہ لوگ اور شہروں میں چین اور سکون سے رہنے والے شہری ان تباہ کاریوں
سے محفوظ رہیں لیکن اس دفعہ کی جنگ لوگوں کے گھروں تک جا پہنچتی ہے۔ کرنل مجید
کو یہ ٹیوب ویل، آٹا پیسنے کی مشین، پکے امرودوں کا باغیچہ اور یہ پلنگ دیکھ کر افسوس
ہونے لگا اور انہوں نے سوچا کہ اپنے پاس بھارت کے مطابق فوج ہوتی تو آج
دشمن سرحد کے اتنا اندر آنے کی جرأت نہ کرتا ـــــ یہ سوچتے سوچتے انہیں اونگھ
آئی۔ ان کا نیم جان جسم پلنگ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن انہوں نے فوجی
ڈسپلن کے مطابق اپنے آپ کو پلنگ سے اٹھا دیا اور آگے چلے گئے۔

چاندنی قدرے صاف ہو گئی تھی۔ ایک گاؤں آ گیا۔ خالی تھا۔ کرنل مجید گاؤں
کے اندر چلے گئے۔ وہاں ایک بھی انسان نظر نہ آیا۔ مکانوں کے دروازے کھلے تھے۔
مکان اندر سے صاف ستھرے تھے۔ وہ ایک مکان میں گئے۔ اندر سے اچھی طرح
دیکھا۔ رہنے والے ہر ایک چیز جُوں کی توں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کرنل مجید نے
راستہ چھوٹا کرنے کے لیے ایک دیوار پھلانگی اور دوسری طرف گرے۔ وہاں
بہت بدبُو تھی۔ یہ جنگ کے اثرات تھے جو قریب کہیں پڑے گل سڑ رہے تھے۔
آگے خالی کھیت تھے۔ کرنل مجید کو وہاں گاڑیوں کے ٹائروں کے نشان نظر آئے۔
انہوں نے بیٹھ کر یہ نشان غور سے دیکھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں توپ خانہ پوزیشن
میں رہ چکا ہے۔ یہ توپ خانہ اپنا ہی ہو سکتا تھا۔

آگے درختوں کا ایک اور جھنڈ نظر آیا۔ وہاں گئے تو زمین پر ٹیلیفون تار پڑی دیکھی کرنل مجید خوش ہوئے کہ یہ تار انہیں اپنی فوج کے کسی ہیڈ کوارٹر یا کسی اگلی پوزیشن میں لے جائے گی۔ وہ تار کو پکڑ کر چلنے لگے لیکن تار آگے جا کر ختم ہو گئی۔ تب کرنل مجید کو خیال آیا کہ وہ تو ٹینک شکن مائن فیلڈ ہے۔ تار کے پرے بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ اگر وہ تار کو پکڑ کر دوسری طرف نہ چل پڑتے تو بارودی سرنگوں پر چلے جاتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ چلتے گئے اور ریلوے لائن تک جا پہنچے۔ انہوں نے چاندنی میں ٹیلیگراف کے کھمبوں پر دیکھا جہاں میل لکھے ہوتے ہیں۔ وہاں سے سیالکوٹ سترہ میل دُور تھا۔ وہ لائن پار کر گئے۔ سامنے سے کوئی آدمی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ یہ بھی بھارتی ہو سکتے تھے۔ کرنل مجید قریب کے کپاس کے کھیت میں جا چھپے۔ دونوں طرف کے توپخانے ایک دوسرے پر بے پناہ گولا باری کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے گولے کرنل مجید کے اوپر سے چیختے چنگھاڑتے گزر رہے تھے۔ کرنل مجید ان آدمیوں کی باتوں کو سُنتے رہے لیکن کوئی بات سمجھ نہ سکے۔

پھر ۱۲ ستمبر کی صبح طلوع ہوئی۔ پہلے دشمن کے لڑاکا بمبار طیارے آئے۔ فوراً ہی پاک فضائیہ کے طیارے پہنچ گئے۔ بھارتی طیارے غائب ہو گئے۔ کرنل مجید نے سوچا کہ وہ کل کی طرح یہاں سارا دن چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ انہوں نے اللہ کا نام لیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے وہ ہر طرف دیکھ سکتے تھے۔ ٹینکوں کی جنگ الہڑ کی طرف ہو رہی تھی۔ دھماکے اور گرد بتاتی تھی کہ بڑا ہی شدید معرکہ لڑا جا رہا ہے۔ کرنل مجید چلتے گئے۔ دو سَو گز دور انہیں کسی کالی چیز کے پاس کھڑے دو فوجی نظر آئے ان کی وردی خاکی تھی۔ ان میں سے ایک کرنل مجید کی طرف چل پڑا۔ یہ اپنی نمبر ۱۴ فرنٹیئر فورس کے جوان تھے۔ یہ بٹالین کرنل مجید کی مدد کے لیے گئی تھی لیکن راستے میں ٹینکوں کا ایسا گھمسان کا معرکہ ہُوا کہ یہ بٹالین کرنل مجید کی بٹالین کی مدد کو نہ پہنچ سکی۔

یہ جوان جس کالی چیز کے پاس کھڑے تھے وہ آر آر گن تھی جو انہوں نے وہاں لگا رکھی تھی۔ اُنہوں نے کرنل مجید کو وہیں سے اپنا ہیڈ کوارٹر بتا دیا۔ وہ جبیوراں کے باہر ایک جھنڈ میں چلے گئے۔ جوں ہی وہاں پہنچے دشمن کے میڈیم توپ خانے وہاں گولا باری شروع کر دی۔ اس مقام پر پہلے ہماری ایک آرٹلری رجمنٹ پوزیشن میں

تھی جو وہاں سے جا چکی تھی۔ بھارتی توپ خانہ اب سانپ کی لکیر کو پیٹ رہا تھا۔ اس فرنٹیئر فورس بٹالین کو اطلاع ملی تھی کہ کرنل مجید آگے شہید ہو گئے ہیں۔ کرنل مجید کو اپنی بٹالین کے متعلق پریشانی تھی جو بہت نقصان اٹھا کر اب جانے کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ انہیں پسرور بھیج دیا گیا۔ انہوں نے رات پسرور میں گزاری۔

۱۳ ستمبر کے روز ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ وہاں بھی ان کی شہادت کی اطلاع دے دی گئی تھی اور ان کی بٹالین کی کمان کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) نواز کو دی جا چکی تھی۔ بٹالین کی کمان کرنل مجید کو دے دی گئی لیکن فوراً ہی انہیں جی۔ ایچ۔ کیو میں بھیج دیا گیا۔ کرنل مجید کو بہت دُکھ ہوا۔ وہ اپنی بٹالین سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے، لیکن حکم کے تحت میدانِ جنگ سے جی۔ ایچ۔ کیو میں چلے گئے۔

اس فرنٹیئر فورس بٹالین نے میدانِ جنگ میں بہت بڑی قربانی دی شہادت تو زیادہ تھی لیکن میدانِ جنگ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی یادگار گیارہ شہیدوں کی وہ پکّی قبریں ہیں جنہیں "ردبالاں والیاں قبراں" کہتے ہیں۔ وہ جہاں شہید ہوئے وہیں دفن ہوئے۔ یہ نمبر ۹ فرنٹیئر فورس کے وہ جانباز تھے جنہیں ٹینکوں کے مقابلے کے لیے بکتر بند گاڑیوں کی بجائے پیدل لڑایا گیا تھا۔ وہ جذبے کی جنگ لڑے اور کٹ گئے۔ پھر بھی دشمن آگے آ گیا، ہماری کھیتیوں اور ہمارے دیہات کو روندتا رہا۔

نعروں اور جذبے سے جنگ لڑی جا سکتی ہے جیتی نہیں جا سکتی۔ اکیلا مورال قوم کو جانباز دے سکتا ہے، شہادت کا رتبہ دے سکتا ہے، یہ عزم دے سکتا ہے کہ دشمن ہماری لاشوں سے گزر کر آگے جائے گا مگر میٹریل کے بغیر مورال کا حشر یہی ہوتا ہے کہ دشمن مشرقی پاکستان کی طرح لاشوں سے گزر کر آگے آ جاتا ہے۔